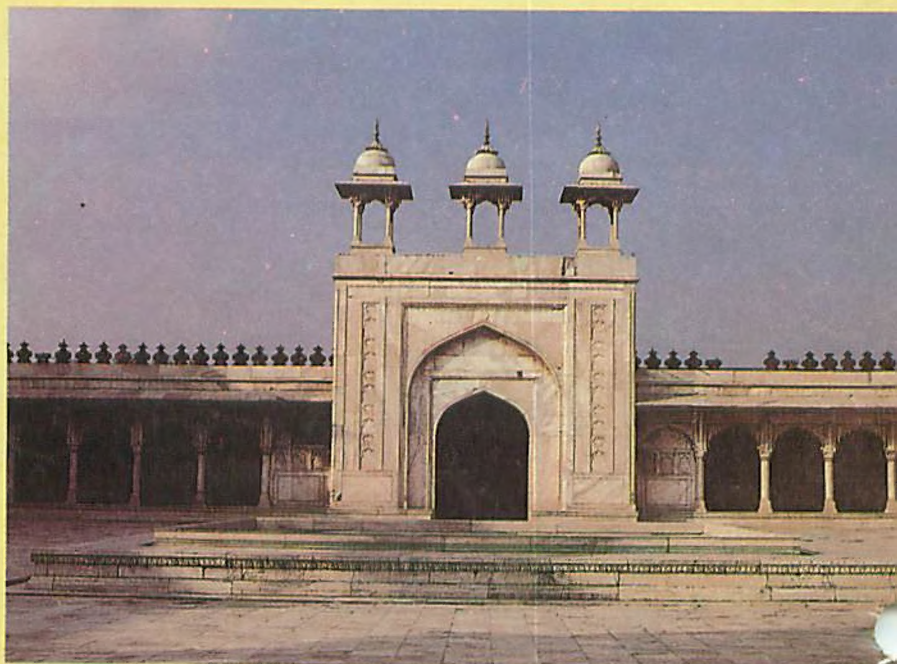
# الرسالہ

# Al-Risala

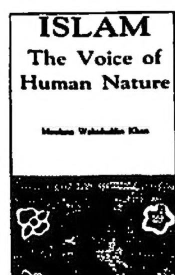
November 1995 • Issue 228 • Rs. 7

سب کچھ کے پیچھے دوڑنے والا کچھ نہیں پاتا
اور جو آدمی کچھ کے پیچھے دوڑے
وہ آخر کار سب کچھ کو پا لیتا ہے۔

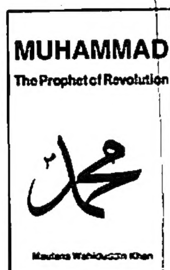


MOTI MASJID (1646-53), AGRA.

# The Islamic Centre Publications




**ISLAM: THE VOICE OF HUMAN NATURE**
22×14.5cm, 64 pages
ISBN 81-85063-74-5
Rs. 30



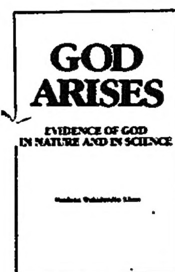

**MUHAMMAD: THE PROPHET OF REVOLUTION**
22×14.5cm, 228 pages
ISBN 81-85063-00-1
Rs. 85



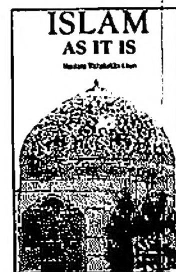

**GOD-ORIENTED LIFE**
22×14.5cm, 186 pages
ISBN 81-85063-97-4
Rs. 70



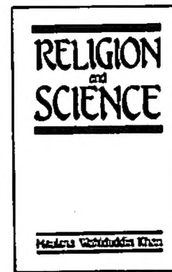

**WOMAN IN ISLAMIC SHARI'AH**
22×14.5cm, 150 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 185 (Hardbound)



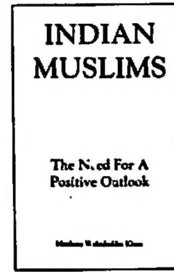

**GOD ARISES**
22×14.5cm, 271 pages
ISBN 81-85063-14-1
Rs. 85




**ISLAM AS IT IS**
22×14.5cm, 114 pages
ISBN 81-85063-95-8
Rs. 55




**RELIGION AND SCIENCE**
22×14.5cm, 96 pages
Rs. 45




**INDIAN MUSLIMS**
22×14.5cm, 192 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 175 (Hardbound)

## 'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages; Rs. 12)
2. The Teachings of Islam (46 pages; Rs. 15)
3. The Good Life (36 pages; Rs. 12)
4. The Garden of Paradise (36 pages; Rs. 15)
5. The Fire of Hell (44 pages; Rs. 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. In the first pamphlet it is shown that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet provides an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to hell-fire.

**AL-RISALA BOOK CENTRE**

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013 Tel. 4611128 Fax: 11-4697333

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

نومبر ۱۹۹۵ ، شمارہ ۲۲۸

| فہرست | صفحہ |
| --- | --- |
| دفع احسن | ۴ |
| مومن کی تطہیر | ۵ |
| خوفِ خدا | ۶ |
| احتیاطی تدبیر | ۷ |
| ترقی کا زینہ | ۸ |
| مذہبی استدلال | ۹ |
| اسلام مذہبِ امن | ۱۱ |
| الفصل بین القضیتین | ۱۷ |
| سفرنامہ یورپ — ۲ | ۲۹ |
| خبرنامہ اسلامی مرکز — ۱۰۳ | ۴۷ |

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

# دفع احسن

ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ہی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم (۴۱ : ۳۴)

اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر تم دیکھوگے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

ایک شخص آپ کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کرے اور آپ اس پر بھڑک کر اس کی مذمت کرنے لگیں تو اس کے اندر ضد پیدا ہوگی۔ اس کی دشمنی اور بڑھ جائے گی۔ آپ کا ایسا ردعمل آگ پر تیل ڈالنے کے ہم معنی ہوگا۔ جس دشمنی کی ابتدائی صورت آپ کے لئے ناخوشگوار ثابت ہوئی تھی، اب آپ کو اس دشمنی کی انتہائی صورت کا تلخ تر تجربہ برداشت کرنا پڑے گا۔

اس کے برعکس اگر آپ ایسا کریں کہ جس آدمی نے آپ کے ساتھ دشمنی والا سلوک کیا ہے، اس کے ساتھ آپ اعراض برتیں۔ یا اس کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا معاملہ کریں تو یہ آگ پر پانی ڈالنے کے ہم معنی ہوگا۔ آپ کا ایسا رویہ دشمن کو نفسیاتی شکست میں مبتلا کر دے گا۔ اس کے بعد اس کا ضمیر جاگ اٹھے گا۔ وہ اندرونی طور پر شرمندگی کے احساس میں مبتلا ہو جائے گا۔ وہ مزید دشمنی کرنے کے بجائے دشمنی کی تلافی کی بات سوچنے لگے گا۔

اشتعال کے جواب میں مشتعل ہونا یا منفی ردعمل کا طریقہ اختیار کرنا دل کی بھڑاس نکالنے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ مگر وہ کوئی مفید نتیجہ برآمد کرنے والا نہیں۔ یہ نادان آدمی کا کام ہے کہ وہ کوئی خلاف مزاج بات دیکھے تو فوراً بھڑک اٹھے۔ عقل مند وہ ہے جو اقدام سے پہلے نتیجہ کی بات سوچے۔ جو آخری نتیجہ کو سامنے رکھ کر اپنے عمل کا نقشہ بنائے نہ کہ محض وقتی جذبہ کے تحت کارروائی کرنے لگے۔

ہر آدمی اصلاً فطرت کا ایک ظاہرہ ہے۔ ہر ایک آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہے۔ بظاہر کوئی شخص آپ کا دشمن ہو تب بھی اس کو ایک انسان سمجھئے۔ اس کی برائی کو نظر انداز کرکے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیجئے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کا قریبی دوست بن گیا۔

# مومن کی تطہیر

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی بیماری یا تکلیف جو مسلم کو پہنچتی ہے وہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جاتی ہے (ما من مرض او وجع یصیب المسلم الا کان کفارۃ لذنبہ)

اس طرح کی روایتیں مختلف الفاظ میں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی یا ذہنی تکلیف عام انسان کے لئے تو صرف تکلیف ہے۔ مگر صاحب ایمان کے لئے وہ گناہوں کو دور کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو آدمی ایمان و اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائے، اس کے لئے خود بخود ایسا ہوتا رہے گا کہ جب بھی کوئی تکلیف پڑی تو اپنے آپ ہی اس کی کوتاہیاں اور اس کے گناہ دھلتے چلے جائیں گے۔ اس کا تعلق تکلیف کے بعد ظاہر ہونے والی نفسیاتی کیفیت سے ہے نہ کہ کسی پر اسرار قسم کے خودکار نظام سے۔

یہ دراصل مومن اور غیر مومن کی نفسیات کے فرق کا معاملہ ہے۔ غیر مومن کو کوئی تکلیف پیش آتی ہے تو اس کو وہ کسی کا ظلم سمجھ کر شکایت اور احتجاج کرتا ہے۔ وہ فریاد و ماتم میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس طرح تکلیف ایک غیر مومن کو منفی ردعمل کے سوا کچھ اور نہیں دیتی۔

اس کے برعکس تکلیف کا معاملہ جب ایک ایسے انسان کے ساتھ پیش آتا ہے جس کو ایمان کی معرفت مل چکی ہو، اسلام نے جس کے ذہنی سانچہ کو بدل ڈالا ہو تو وہ تکلیف کا استقبال خدائی آزمائش کے طور پر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تکلیف اس کے اندر خود احتسابی پیدا کرتی ہے۔ وہ تواضع اور اعتراف میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ نفسیاتی حالت اس کو خدا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دعا کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے گناہوں اور اپنی کوتاہیوں سے معافی مانگنے لگتا ہے۔

اس طرح تکلیف مومن کے لئے پاکی کا سبب بن جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر، تکلیف میں غیر مومن کے لئے منفی نتیجہ ہے اور مومن کے لئے مثبت نتیجہ۔

# خوف خدا

عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن الحکم الاموی (۶۱-۱۰۱ ھ) کا درجہ اسلام میں اتنا بڑا ہے کہ ان کو پانچویں خلیفہ راشد (خامس الخلفاء الراشدین) کہا جاتا ہے۔ ان کی مدت خلافت ڈھائی سال ہے۔ ان کے حالات پر کئی مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً:

| | |
|---|---|
| ابن الجوزی | سیرۃ عمر بن عبدالعزیز |
| عبداللہ بن الحکیم | سیرۃ عمر بن عبدالعزیز |
| عبدالرؤف المناوی | سیرۃ عمر بن عبدالعزیز |
| احمد زکی صفوت | عمر بن عبدالعزیز |
| عبدالعزیز سیدالاہل | الخلیفۃ الزاہد |

اموی خلفاء میں وہ واحد خلیفہ ہیں جن کا اعتراف ان کے بعد عباسیوں نے کیا۔ شیعہ حضرات کے درمیان بھی ان کا احترام پایا جاتا ہے۔ اہل اسلام کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی ان کا غیر معمولی اعتراف کیا گیا۔ محمد بن معبد کہتے ہیں کہ میں شاہ روم کے یہاں گیا تو اس کو مغموم حالت میں زمین پر بیٹھا ہوا پایا۔ میں نے حال پوچھا تو اس نے کہا، کیا تم کو معلوم نہیں کہ کتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا حادثہ۔ اس نے کہا کہ مرد صالح کا انتقال ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ کون۔ شاہ روم نے کہا کہ عمر بن عبدالعزیز۔ میرا خیال ہے کہ عیسیٰ بن مریم کے بعد اگر کوئی شخص مردہ کو زندہ کرنے والا ہوتا تو یقیناً وہ عمر بن عبدالعزیز ہوتے۔ ایک مسیحی راہب کو لوگوں نے روتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ زمین پر ایک نور تھا، مگر اب وہ نور نہیں رہا۔

عمر بن عبدالعزیز کی موت کے بعد کچھ لوگ ان کی اہلیہ کے پاس گئے اور کہا کہ ان کی کوئی خاص بات بتائیے۔ اہلیہ نے کہا کہ خدا کی قسم، عمر نماز اور روزہ میں تم سے زیادہ نہ تھے۔ مگر خدا کی قسم، میں نے کبھی کسی انسان کو نہیں دیکھا جو عمر سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو (واللہ ما کان عمر باکثرکم صلاۃ ولا صیاما ولکنی واللہ ما رأیت عبداً للہ قط کان اشد خوفاً للہ من عمر)

# احتیاطی تدبیر

فطرت کا ایک اصول پیشگی احتیاط ہے۔ اسی اصول کے تحت زندگی کے مختلف شعبوں میں احتیاطی تدابیر (precautionary measures) اختیار کی جاتی ہیں۔ اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ اگر پیشگی تدبیر اختیار کر لی جائے تو متوقع حادثہ پیش نہیں آتا۔

مثال کے طور پر ہرنیا ایک بیماری ہے۔ جس آدمی کو یہ بیماری ہو جائے اس کو آپریشن تھیٹر میں جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر اس بیماری کی پیشگی تدبیر تقریباً یقینی طور پر اس کو ظہور میں آنے سے روک دیتی ہے۔ یہ پیشگی تدبیر انڈرویر کا استعمال ہے۔ ہرنیا کبھی اچانک نہیں ہوتا۔ اس کی ابتدائی علامت بہت پہلے سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اگر آدمی ایسا کرے کہ ابتدائی علامت ظاہر ہوتے ہی وہ مخصوص انڈرویر پہننا شروع کر دے تو وہ اس بیماری میں مبتلا ہونے سے بچ جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں کھلاڑیوں کے استعمال کے لئے بہت عمدہ قسم کے انڈرویر بنائے گئے ہیں۔ ان کو ایتھلیٹک سپورٹر (athletic supporter) کہا جاتا ہے۔ یہ ایتھلیٹک سپورٹر گویا نہایت موثر قسم کی پیشگی تدبیر ہے جو ہرنیا کی بیماری سے بچاؤ کی تقریباً یقینی ضمانت ہے۔

اسی طرح اجتماعی جھگڑوں کے لئے بھی پیشگی تدابیر ہیں۔ یہ تدبیریں اجتماعی جھگڑوں کو روکنے میں نہایت مؤثر ہیں۔ مثلاً باہمی غلط فہمیوں کو دور کرنا، افواہوں کی بروقت تردید کرنا، ہر بستی میں امن کمیٹی بنانا، اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں ٹکراؤ کے بجائے مفاہمت کا انداز اختیار کرنا، فریق ثانی کو دشمن سمجھنے کے بجائے اس کو ایک انسان سمجھ کر اس سے برادرانہ معاملہ کرنا۔ نزاع اگر عملاً پیش آجائے تو "لو اور دو" کے اصول پر معاملہ کو ختم کرنا۔ جس شخص یا گروہ کے ساتھ نزاع پیش آگئی ہے اس سے حریفانہ طریقہ کے بجائے برادرانہ طریقہ اختیار کرنا، وغیرہ۔

موجودہ دنیا کے خالق نے ہر معاملہ میں پیشگی بچاؤ کے طریقے رکھ دئے ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ان طریقوں کو دریافت کرے اور ان کو استعمال کر کے اپنے آپ کو ان کی زد میں آنے سے بچالے۔

# ترقی کا زینہ

جی ڈی برلا ہندستان کے چند انتہائی بڑے صنعت کاروں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے برٹش دور میں معمولی حیثیت سے آغاز کیا اور اپنی زندگی ہی میں افسانوی حیثیت حاصل کرلی۔ وہ بجا طور پر ہندستانی صنعت کے معماروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

برلا کی ایک سوانح حیات چھپی ہے جس کا نام ہے "کرم یوگی گھنشیام جی" اس کتاب کا دیباچہ ان کے صاحبزادہ کے کے برلا نے لکھا ہے۔ یہ دیباچہ ہندستان ٹائمس (۲۰ اپریل ۱۹۹۴) نے اپنے خصوصی شمارہ میں شائع کیا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جی ڈی برلا ابتداءً کلکتہ کی ایک برٹش فرم میں بروکر (دلال) تھے۔ وہ محنت اور دیانتداری کے ساتھ اپنا کام کرتے تھے اس لئے متعلق افراد ان سے خوش رہتے تھے۔ برلا بظاہر اپنے کام پر مطمئن تھے۔ ان کے دل میں کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ خود اپنی کوئی انڈسٹری لگائیں۔ مگر حالات کے اعتبار سے اس طرح کا فیصلہ لینا آسان بھی نہ تھا۔ چنانچہ بروکر کی حیثیت سے وہ اپنے کام میں لگے رہے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ کمپنی کی بلڈنگ میں اوپر جانے کے لئے برلا ایک لفٹ میں داخل ہوئے۔ اس میں ایک انگریز تھا۔ اس نے برلا کو یہ کہہ کر باہر نکال دیا کہ یہ لفٹ انڈین کے استعمال کے لئے نہیں ہے۔ یہ واقعہ توہین آمیز اور اشتعال انگیز تھا۔ لیکن برلا نے ایسا نہیں کیا کہ اس کے بعد وہ انگریزوں پر اپنا غصہ اتارنے میں مصروف ہو جائیں۔ اس کے بجائے یہ واقعہ ان کے لئے ایک مہمیز بن گیا۔ برلا کے فرزند کی زبان میں، لفٹ کے واقعہ نے انھیں شدید طور پر متاثر کیا۔ اور ان کو فوری فیصلہ تک پہنچانے کا سبب گیا:

The lift incident acted as a catalyst and made him take an early decision. (p. 8)

برلا نے کمپنی کا کام چھوڑ دیا۔ اور ذاتی کاروبار کے میدان میں داخل ہو گئے۔ وہ یکسوئی کے ساتھ محنت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ملک کے عظیم صنعت کار بن گئے۔ زندگی میں حادثات کا پیش آنا بھی فطری ہے۔ دانش مند وہ ہے جس کے لئے حادثہ مزید ترقی کا زینہ بن جائے۔

# مذہبی استدلال

مسٹر خوشونت سنگھ کا ایک ریگولر کالم ہندستان ٹائمس میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا عنوان ہوتا ہے : ہرکس وناکس کے لئے عداوت کے ساتھ (with malice towards one and all) اخبار کے شمارہ ۲۵ مارچ ۱۹۹۵ میں اس کالم کا ایک عنوان تھا سائنس بمقابلہ خدا (Science versus God) اس میں انھوں نے بتایا کہ ایک اطالوی خاتون (Cedra Osborne) کے خط کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ میں نے تمام مذہبی عقائد کو اور پیغمبروں کو چھوڑ دیا ہے جنھوں نے خدائی علم کا دعوا کیا۔ اور یہ کہ جب تک کوئی شخص مجھے ان سوالوں کا جواب نہ دے اس وقت تک میں لاادریہ (agnostic) رہوں گا۔ یعنی یہ ماننا کہ خدا یا دوسری غیر مادی اشیاء کی ہستی کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں۔

وہ تین سوالات یہ ہیں (۱) ہم کہاں سے آئے ہیں (۲) ہم یہاں کیوں ہیں (۳) موت کے بعد ہم کہاں جاتے ہیں :

> I wrote to her that I had discarded all religious faith and world's prophets who claimed knowledge of Him. And that till somebody gave me answers to three questions I would remain an agnostic. My questions are: Where have we come from? Why are we here? Where do we go when we die? *The Hindustan Times*, New Delhi, March 25, 1995

میں کہوں گا کہ ان سوالات کا جواب بے حد آسان ہے۔ وہ یہ کہ دوسری حقیقتوں کو ماننے کے لئے انھوں نے جو اصول بالفعل اختیار کر رکھا ہے، اسی کو وہ مذہب اور خدا کے معاملہ میں بھی اختیار کرلیں۔ اور اس کے بعد انھیں اپنے تمام سوالات کا جواب مل جائے گا۔

جو لوگ اپنے کو لاادریہ (agnostic) کہتے ہیں وہ ایک زبردست غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس فکری مشکل کی وجہ سے وہ خدا اور مذہب کے معاملہ میں متشکک بن گئے ہیں، وہ فکری مشکل صرف مذہبی سوالات کے بارہ میں ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ فکری مشکل ہر مسئلہ کے ساتھ لگی ہوئی ہے، خواہ وہ کوئی بھی مسئلہ ہو۔

مذہبی عقائد کے بارہ میں متشکک بننے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ محسوس عقلی دلائل کے

ذریعہ ثابت نہیں ہوتے۔ مگر ٹھیک یہی بات دوسرے تمام امور کے بارہ میں ہے۔ مثال کے طور پر مسٹر خوشونت سنگھ نے جس میز پر بیٹھ کر یہ الفاظ لکھے ہیں، اس کا معاملہ بھی اتنا ہی مشتبہ ہے جتنا کہ ان کے نزدیک مذہبی عقائد کا معاملہ۔ کیوں کہ یہ میز بظاہر ایک محسوس صورت میں دکھائی دے رہی ہے۔ مگر سائنسی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ کوئی دکھائی دینے والی چیز نہیں۔

اس دنیا میں آدمی جس چیز کو بھی مانتا ہے، قرائن کی بنیاد پر مانتا ہے نہ کہ محسوس دلائل کی بنیاد پر۔ کیوں کہ محسوس دلائل قائم کرنا کسی بھی چیز پر ممکن نہیں۔ ہر آدمی، حتی کہ متشکک بھی اس اصول کو مانتا ہے۔ اگر وہ نہ مانے تو وہ زندگی گزار نہیں سکتا۔ اس اصول کو نہ ماننے کی صورت میں وہ ہر چیز، حتی کہ کھانے اور پانی پر بھی شک کرے گا۔ پھر وہ کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد اب اصل سوال پر آئیے۔ مسٹر خوشونت سنگھ (یا ان کی طرح کے دوسرے لوگوں کے) ان سوالات کا جواب یہ ہے:

۱۔ ہم عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ اور ہم کو خدا نے پیدا کیا ہے۔

۲۔ دنیا میں ہماری زندگی کا مقصد آزمائش ہے، یہاں ہم خدا کی طرف سے حالت امتحان میں ہیں۔

۳۔ موت کے بعد ہم عالم آخرت کی طرف چلے جاتے ہیں تاکہ اپنے موجودہ ریکارڈ کے مطابق اس کا انجام پائیں۔

یہ جوابات کیوں صحیح ہیں۔ وہ اس لئے صحیح ہیں کہ تمام قابل حصول قرائن اس کی صحت کی تائید کرتے ہیں۔ اس میں فطرت انسانی کے مطالبات کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اور اس معاملہ کی اس سے بہتر کوئی اور توجیہ ابھی تک سامنے نہ آسکی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب مذہب اور جدید چیلنج۔)

زندگی اور کائنات سے متعلق کوئی بھی چیز جس کو ہم مانتے ہیں اس کو اسی طرح قرائن کی بنیاد پر مانتے ہیں۔ تمام چیزوں کو ہم علم ظنی ہی کی بنیاد پر مانتے ہیں نہ کہ علم قطعی کی بنیاد پر۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک دیانت دار آدمی کے لئے صرف دو میں سے ایک کا چوائس ہے۔ وہ تمام چیزوں کو یا تو قرائن کی بنیاد پر مانے یا کسی بھی چیز کو نہ مانے۔ مسٹر خوشونت سنگھ جیسے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ "تھرڈ آپشن" لے رہے ہیں۔ جب کہ تھرڈ آپشن ممکن ہی نہیں۔

# اسلام مذہبِ امن

یورپ کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان سے ہوئی۔ وہ ایک عرب ملک سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ روزگار کی تلاش میں تھے۔ اس سلسلہ میں وہ ایک غیر مسلم ادارہ میں انٹرویو کے لئے گئے۔ گفت گو کے دوران انٹرویور نے ان سے پوچھا کہ کیا تم مسلمان ہو۔ نوجوان نے کہا کہ ہاں۔ یہ سن کر انٹرویور نے فوراً کہا کہ پھر تو تم دہشت گرد ہو:

Then you are a terrorist.

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ایک طبقہ کے کٹرپن اور اس کی جنگ جویانہ سرگرمیوں کی وجہ سے عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ اسلام دہشت گردی (terrorism) کا مذہب ہے۔ اسلام اپنا مقصد جنگ اور تشدد کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر یہ بات مکمل طور پر خلاف واقعہ ہے۔

اسلام مسلمانوں کے کسی رویہ کا نام نہیں ہے۔ اسلام ایک اصولی مسلک کا نام ہے، وہ کسی قوم کے قومی طرز عمل کا نام نہیں۔ مسلمانوں کے عمل کو اسلام سے جانچا جائے گا نہ کہ اسلام کو مسلمانوں کے عمل سے جانچا جانے لگے۔ اگر کچھ مسلمان دہشت گردی کی روش اختیار کئے ہوئے ہیں تو اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں نہ کہ اسلام۔ ان کے اسلامی نعرہ کی وجہ سے ان کا عمل اسلام کا عمل نہیں بن جائے گا۔

اسلام پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور آپ کے نمونہ حیات کا نام ہے۔ اور پیغمبر اسلام امن کے پیغمبر تھے، وہ جنگ کے پیغمبر نہیں تھے۔ اسی لئے قرآن میں آپ کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے تم کو ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے (وما ارسلناك الا رحمةً للعالمين)

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے۔ ان کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام حرب رکھا۔ عرب ایک جنگجو قوم تھے۔ چنانچہ وہ جنگی

ناموں کو پسند کرتے تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام کو معلوم ہوا تو آپ نے حرب نام کو پسند نہیں کیا۔ آپ نے کہا کہ اس کے بجائے تم بچہ کا نام حسن رکھو۔

اس سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ آپ پورے معنوں میں ایک امن پسند انسان تھے۔ آپ کی امن پسندی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آپ حرب جیسا لفظ سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ تشدد میں نہیں بلکہ حسن اخلاق میں یقین رکھتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم انقلاب لے آئے۔ مگر یہ انقلاب امن کی قوت سے برپا کیا گیا نہ کہ جنگ کی قوت سے۔ اگر کبھی آپ نے جنگ کی تو وہ مجبورانہ دفاع کے طور پر تھی نہ کہ آپ کی اپنی پسند اور آپ کے اپنے انتخاب کے تحت۔

امن آپ کی زندگی کا ایک عمومی اصول تھا اور جنگ صرف ایک اتفاقی استثناء۔ چنانچہ اپنی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں آپ نے صرف تین لڑائی لڑی (بدر، احد، حنین) یہ تینوں لڑائیاں دفاعی تھیں اور ان میں مجموعی طور پر صرف ڈیڑھ دن صرف ہوئے۔

زید بن مُہَلہِل نجد میں بعثت نبوی سے پہلے پیدا ہوئے۔ وہ شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے شمشیر زنی اور گھوڑے کی سواری میں شہرت حاصل کی۔ چنانچہ وہ زید الخیل کہے جانے لگے۔ خیل عربی زبان میں گھوڑے نیز گھوڑے سوار کو کہتے ہیں۔

انھوں نے اسلام سے پہلے فارِس (شہ سوار) اور شمشیر زن کی تعریف پر ایک پرجوش نظم کہی تھی۔ اس میں وہ اپنے قبیلہ کے بارہ میں کہتے ہیں کہ میری قوم لوگوں کی سردار ہے۔ اور سردار ہی اس وقت قائد بنتا ہے جب کہ شعلہ بار ہتھیلیوں نے جنگ کی آگ کو بھڑکا دیا ہو:

وقومِي رؤوس الناسِ والرأسُ قائدٌ    اذا الحربُ شَبَّتْهَا الأَكُفُّ المساعِرُ

زید الخیل ہجرت کے بعد مدینہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام قبول کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید الخیل کا نام پسند نہیں کیا۔ آپ نے ان کا نام بدل کر زید الخیر رکھ دیا۔ ۹ ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا۔

یہ واقعہ اسلام کی اسپرٹ کو بتاتا ہے۔ اسلام دین رحمت ہے۔ اسلام کا مقصد آدمی کو زید شہ سوار بنانا نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ آدمی زید صاحب خیر بنے۔ قدیم

عرب میں گھوڑا دوڑانا اور تلوار کا کمال دکھانا ہیروانہ کام سمجھا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام نے ان کے جذبات کو موڑا۔ اور ان کو یہ ذہن دیا کہ وہ خیر کے حامل بنیں، وہ خیر کے میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیں۔ وہ لوگوں کو موت کا تحفہ نہ دیں بلکہ وہ لوگوں کو زندگی کا تحفہ دینے کی کوشش کریں۔

آجکل کی زبان میں اگر کہا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کا مقصد تخلیقی (creative) انسان پیدا کرنا ہے۔ اللہ پر ایمان آدمی کے اندر تخلیقی اوصاف کو جگا دیتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ عام سوچ سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ اس کا کردار دوسرے لوگوں کے کردار سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ زمین میں رہتے ہوئے ایک آسمانی انسان بن جاتا ہے۔ وہ ظواہر میں جینے کے بجائے حقائق میں جینے لگتا ہے۔

دوسرے لوگ اگر اپنی ذات کو چاہنے والے ہوتے ہیں تو وہ خیر کو چاہنے والا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ اگر استحصال کرنے والے ہوتے ہیں تو وہ نفع پہنچانے والا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے مزاج میں اگر سرکشی ہوتی ہے تو اس کے مزاج میں تواضع ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی خصوصیت اگر جنگ پسند ہوتی ہے تو اس کی خصوصیت امن پسند۔ دوسرے افراد اگر لوگوں کو مار کر خوش ہوتے ہیں تو وہ لوگوں کو زندگی دے کر خوشی حاصل کرتا ہے۔ دوسروں کے پاس اگر لوگوں کے لئے نفرت کا تحفہ ہوتا ہے تو اس کے پاس صرف محبت کا تحفہ، خواہ دوسرے لوگ اس سے نفرت کا معاملہ کیوں نہ کر رہے ہوں۔

صحیح البخاری میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اجتماعی امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔ امام البخاری نے یہ حدیث چار ابواب کے تحت نقل کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ماخُيِّرَ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم بين امرين إلّا أخذَ أيسرهما (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ٦/٦٥٢)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو معاملوں میں سے ایک کو لینا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کو لیتے تھے۔

یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں

کے درمیان آپ کو جو معاملات پیش آتے تھے، ان میں آپ ہمیشہ آسان پہلو کا انتخاب فرماتے تھے۔ جب ایک طریقہ امن کا ہو اور دوسرا طریقہ ٹکراؤ کا، ایک طرف نزاع ہو اور دوسری طرف موافقت ہو، ایک جنگ کا راستہ ہو اور دوسرا صلح کا راستہ ہو، تو ان تمام صورتوں میں آپ اسی صورت کو اختیار کرتے تھے جو نسبتاً سہل اور آسان ہو۔ غور کیا جائے تو یہ اصول آپ کی پوری زندگی پر چھایا ہوا نظر آئے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت ایک معلوم اور مشہور سنت ہے۔ مگر عام طور پر اس کا انطباق صرف چھوٹے چھوٹے امور میں کیا جاتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھا رہے ہوتے اور پیچھے سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آجاتی جس کو اس کی ماں مسجد میں لائی تھی تو آپ نماز کو مختصر کر دیتے۔ ایسی حالت میں آپ لمبی سورہ پڑھنے کے بجائے چھوٹی سورہ پڑھ کر نماز کو جلد ختم کر دیتے تاکہ بچہ کی ماں کو پریشانی نہ ہو۔ مگر زیادہ بڑے بڑے امور میں اس سنت کا ذکر نہیں کیا جاتا اور نہ بڑے امور میں اس کو منطبق کیا جاتا ہے۔

مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اگر آپ کعبہ کی تطہیر سے اپنی مہم کا آغاز کرتے تو یہ آپ کے لئے مشکل انتخاب ہوتا۔ اس لئے آپ نے دلوں کی تطہیر سے اپنے کام کا آغاز فرمایا۔ چنانچہ قرآن میں پہلی آیت یہ اتاری گئی کہ اقرأ باسم ربك الذی خلق گویا کہ طهر الكعبة من الاصنام کے بجائے آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ طهر القلوب من الاصنام۔

مکی زندگی کے آخر میں آپ کے مخالفین آپ کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت ایک صورت یہ تھی کہ آپ دفاعی ذہن کے تحت تمام مسلمانوں کو متحد کر کے جنگ کا طریقہ اختیار کرتے۔ اس کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ مقابلہ کے بجائے ترک مقام کو اختیار کرنا تھا۔

حدیبیہ کے واقعہ میں آپ کے لئے جنگ اور واپسی میں انتخاب کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ آپ نے یہاں بھی جنگ کے طریقہ کو چھوڑا اور میدان سے واپسی کے طریقہ کو لے لیا۔

جن لوگوں نے حج یا عمرہ کیا ہے۔ انھوں نے دیکھا ہے کہ کعبہ سے متصل ایک جگہ ہے جس کو حطیم کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ حضرت ابراہیم کی تعمیر کے مطابق، کعبہ میں شامل تھی۔ بعد کو مشرکین نے نئی تعمیر کے وقت اس کو الگ کر دیا۔ فتح مکہ کے بعد آپ کو موقع تھا کہ کعبہ کو از سر نو بنا کر حطیم کو اس میں شامل کر دیں۔ مگر اس وقت کے حالات میں یہ ایک نزاعی کام تھا۔ چنانچہ نزاع سے بچنے کی خاطر آپ نے کعبہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جیسا کہ مشرکین نے اسے بنایا تھا۔

غور کیا جائے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی اصول (اختیار الیسر) کا مصداق نظر آئے گی۔ آپ نے ہمیشہ ہر معاملہ میں مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کا انتخاب فرمایا ہے۔ اسی اصول کو موجودہ زمانہ میں پر امن طریق عمل (peaceful method) کہا جاتا ہے۔

جنگ اور تشدد کا طریقہ اسلام کے لئے مفید نہیں ہے۔ جنگ باز آدمی تشدد کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کا طریقہ اسلام کے لئے بالکل اجنبی ہے۔ کیوں کہ اسلام کا مقصد دل و دماغ کو بدلنا ہے اور دل و دماغ کو بدلنے کا کام تشدد کے ذریعہ کیا جانا ممکن نہیں۔ دل و دماغ کو بدلنے کا کام نصیحت (persuasion) کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ طاقت (force) کے ذریعہ۔

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی معرفت حاصل ہو۔ لوگ آخرت کی جوابدہی کے احساس میں جینے والے بنیں۔ لوگوں کے اندر وہ اعلا روحانی اوصاف پیدا ہوں جن کو تقویٰ، خشیت، انابت، تضرع، اخبات، وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ لوگ حق کو پہچاننے والے اور حق کا اعتراف کرنے والے بنیں۔ لوگوں کے اندر وہ ربانی شخصیت پرورش پائے جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔

یہی اسلام کا اصل مطلوب ہے اور جنگ یا تشدد کے ذریعہ اس مطلوب کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ پر امن دعوت و تبلیغ ہے۔ اسلام کے طریق کار کو ایک لفظ میں دعوتی طریقہ کہا جا سکتا ہے نہ کہ جنگ جویانہ طریقہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام ایک دعوت ہے۔ اور دعوتی عمل صرف پر امن حالات

میں انجام دیا جاسکتا ہے۔ جہاں تناؤ اور ٹکراؤ کا ماحول ہو وہاں دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے اسلام چاہتا ہے کہ ہر قیمت پر انسانوں کے درمیان امن قائم رہے۔ حتی کہ امن کے قیام کے لئے اگر اہل اسلام کو یک طرفہ قربانی دینا پڑے تو یک طرفہ قربانی دے کر انھیں امن و امان کو قائم کرنا چاہئے۔

طریق کار ہمیشہ آدمی کے اپنے مشن کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے۔ اسی لئے دادا کا طریق کار ایک تاجر کے طریق کار سے مختلف ہوتا ہے۔ دادا کا مقصد لوگوں کو خوف زدہ کرنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لوگ جتنا زیادہ اس سے خوف میں رہیں گے اتنا ہی زیادہ اس کو اپنا مقصد حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس لئے دادا یہ کرتا ہے کہ وہ تشدد اور ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی طاقت کا تجربہ کراتا ہے۔ کیوں کہ ڈر کی نفسیات اسی طریقہ کے ذریعہ پیدا کی جاسکتی ہے۔

مگر تاجر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ تاجر کا مقصد لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانا ہے۔ گرویدہ ہونے کے بعد ہی کوئی شخص ایک تاجر کے سامنے اپنی جیب خالی کرنے پر راضی ہو سکتا ہے۔ اس لئے تاجر محبت اور صلح کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ محبت اور صلح کے ذریعہ ہی وہ کسی کو اپنا گاہک بنا سکتا ہے۔

اسلام ایک دعوتی مذہب ہے۔ اس لئے اسلام اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ دادا والا طریقہ اختیار کرے۔ اسلام کے لئے صرف تاجر والا طریقہ ہی مفید اور کارگر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں یک طرفہ حسن سلوک پر زور دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جنگ کے بجائے صلح اور تشدد کے بجائے امن کی تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کا مقصد لوگوں کا ذہن بدلنا اور ان کا دل جیتنا ہے۔ اور اس قسم کا سنجیدہ کام صرف پرامن طور پر ہی انجام دیا جاسکتا ہے۔ تشدد کا طریقہ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہے نہ کہ معاون۔

# الفصل بین القضیتین

سعودی کنگ فیصل بن عبد العزیز (۱۹۷۵-۱۹۰۶) نہایت مدبر حکمراں تھے۔ پورے عالم اسلام میں انھیں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری تمنا ہے کہ میں یروشلم جاؤں اور مسجد اقصیٰ میں داخل ہو کر نماز ادا کروں۔ مگر وہ اپنی یہ تمنا پوری نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ ان کا آخر وقت آگیا اور وہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے چلے گئے۔

اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فیصل مرحوم یہ سمجھتے تھے کہ جب تک ایسا نہ ہو کہ یروشلم (فلسطین) سے یہودیوں کی حکومت ختم ہو کر وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے، اس وقت تک ایسا کرنا ممکن نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ موجودہ حالات میں وہاں جانا یروشلم پر یہودیوں کے سیاسی قبضہ یا سیاسی غصب کو تسلیم کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ اس ذہنی رکاوٹ کی وجہ سے وہ یروشلم نہیں گئے اور اپنے دل کی تمنا دل ہی میں لئے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو۔

یہ شاہ فیصل کی کوئی انفرادی رائے نہ تھی۔ بلکہ یہی عام طور پر علماء اسلام کا موقف ہے جس کو انھوں نے اس وقت سے اختیار کر رکھا ہے جبکہ یروشلم پر یہودیوں کا سیاسی قبضہ ہوا۔ ۱۹۱۷ میں یروشلم ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ میں جزئی طور پر اور ۱۹۶۷ میں کلی طور پر اس کے اوپر یہودیوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اس سلسلہ میں مصر کے شیخ الازھر کا ایک فتویٰ اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ دوسرے علماء اسلام کی رائے بھی قولاً یا عملاً یہی ہے:

"مصر کی قدیم دینی درس گاہ جامعۃ الازہر کے مفتی شیخ جاد الحق علی جاد الحق نے مصر اور دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں پر بیت المقدس اور مسجد الاقصیٰ میں جانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ انھوں نے فتویٰ جاری کیا ہے کہ مسجد الاقصیٰ اور بیت المقدس کی (سیاسی) آزادی تک عام مسلمانوں کا وہاں جانا غیر اسلامی اور غیر شرعی ہے۔ اس لئے فلسطین اور بیت المقدس کے باسیوں کے سوا دیگر تمام مسلمانوں کو اسرائیل سے (سیاسی) آزادی سے پہلے مسجد الاقصیٰ میں نہیں جانا چاہئے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مقامات

مقدس پر اسرائیلی تسلط کو قبول کر لیا ہے۔ جامعۃ الازہر کے مفتی اعظم کے فتوی کے بعد حکومت مصر نے اپنے باشندوں کے بیت المقدس جانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔" (نوائے وقت، لاہور ۱۹ ذی الحجۃ ۱۴۱۵ھ - ۱۹ مئی ۱۹۹۵ء)

یہ ایک نہایت اہم شرعی مسئلہ ہے، جس کے بارے میں قرآن وسنت کی بنیاد پر کوئی عملی موقف اختیار کرنا چاہیے، نہ کہ محض ذاتی احساس یا قومی غیرت وحمیت کی بنیاد پر۔ فلسطین اور بیت المقدس پر یقیناً اہل اسلام کا حق ہے۔ اس کی آزادی کے لیے ان کو پُرامن ذرائع سے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔ تاہم قرآن وسنت کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے خالص عبادتی مقصد کے تحت ایسے وقت میں بھی اس مقدس مقام کی زیارت ممنوع نہیں جب کہ وہاں غیر مسلموں کا تسلط قائم ہو۔ دوسری طرف موجودہ زمانہ میں مذہبی آزادی کے بین اقوامی اعتراف نے بھی علی الاطلاق طور پر اس کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ مگر مذکورہ قسم کے فتاویٰ کی بنا پر دنیا کے مسلمان نسل در نسل اس عظیم سعادت سے محروم ہو رہے ہیں کہ وہ مسجد اقصیٰ میں داخل ہوں اور تیسرے سب سے افضل مقام پر اللہ کی عبادت کر سکیں۔

اگست ۱۹۹۵ میں یروشلم میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کا اہتمام اٹلی کے عیسائیوں کی ایک جماعت نے کیا تھا۔ اور اس کا موضوع یہی خاص مسئلہ تھا۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے اس کانفرنس میں شرکت کی اور اس موقع پر ایک مقالہ (انگریزی میں) پیش کیا۔ اس کا عنوان اسلام میں امن تھا:

Policy of peace in Islam

اس مقالہ کو (اردو میں) ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

---

قرآن اپنے بتائے ہوئے طریقہ کو سبل السلام (المائدہ ۱۶) کہتا ہے۔ یعنی امن کے راستے۔ قرآن میں صلح کی پالیسی کو سب سے بہتر پالیسی بتایا گیا ہے (النساء ۱۲۸) نیز فرمایا کہ خدا بدامنی کو پسند نہیں کرتا (البقرہ ۲۰۵) حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ المؤمن من امنہ الناس علی دمائھم واموالھم (الترمذی، کتاب الایمان) یعنی مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے خون اور اپنے مال کے معاملہ میں محفوظ ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں ایک عملی سوال یہ ہے کہ

موجودہ دنیا میں ہمیشہ کسی نہ کسی سبب سے لوگوں کے درمیان سیاسی یا غیر سیاسی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ افراد میں بھی اور قوموں میں بھی۔ مسلمانوں کے اپنے اندر بھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بھی۔ اب اگر لوگ اختلافات کو برداشت نہ کریں، بلکہ اختلاف کے پیدا ہوتے ہی اس کے خاتمہ پر اصرار کریں تو لڑائی ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کبھی بھی دنیا میں امن قائم نہ ہو سکے گا۔ ایسی حالت میں سوال ہے کہ امن کا مقصد کس طرح حاصل کیا جائے۔

اس اختلاف کی ایک تازہ مثال یروشلم کا مسئلہ ہے۔ یروشلم ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بلینوں انسان اس کو اپنا مقدس مقام مانتے ہیں۔ اس کی امتیازی صفت یہ ہے کہ تین سامی مذاہب کی تاریخ اس کے ساتھ وابستہ ہے۔

یروشلم تین بڑے مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کو ماننے والوں کے لئے ان کی تاریخی یادوں کی علامت ہے۔ وہ ان کے لئے ایک جذباتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہودیوں کے لئے اس کی اہمیت یہ ہے کہ ان کے نزدیک وہ ان کی قدیم عظمت کا ایک زندہ ثبوت ہے اور ان کی قومی تاریخ کا مرکز ہے۔ عیسائیوں کے لئے وہ ان کے نجات دہندہ حضرت مسیح کی جغرافی یادگار ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس کی اہمیت یہ ہے کہ اسرار اور معراج کے سفر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ٹھہرے اور یہاں باجماعت نماز میں تمام نبیوں کی امامت فرمائی۔

اس طرح ان تینوں مذاہب کے لئے یروشلم ایک زیارت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تینوں مذاہب کے لوگ چاہتے ہیں کہ یہاں آکر وہ روحانی تسکین حاصل کریں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب تینوں مذہبوں کے لئے وہ مقدس زیارت گاہ ہے تو کس طرح وہ تینوں کے لئے کھلا رہے اور کس طرح تینوں مذہب کے ماننے والوں کو یہ موقع حاصل رہے کہ وہ بہ آسانی وہاں پہنچ کر اپنے جذبات عقیدت کی تسکین حاصل کریں۔

آجکل ہر طرف القدس لنا کا نعرہ سنائی دیتا ہے۔ یہ نعرہ سیاسی مفہوم میں ہے اور ہر فریق یہ نعرہ لگا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فریق یہ چاہتا ہے کہ قدس یا یروشلم پر صرف اس کا قبضہ رہے۔ کیوں کہ اس کے نزدیک جب تک اس مقدس شہر پر اس کا سیاسی غلبہ نہ ہو وہ صحیح طور پر اپنا عبادتی عمل وہاں انجام نہیں دے سکتا۔

اگر اس مقدس مقام کی زیارت کی شرط یہ ہو کہ جو شخص یا گروہ یروشلم میں جائے اس کی قوم کا سیاسی قبضہ بھی وہاں قائم ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ شہر عملی طور پر عبادت کا مقام نہ رہے گا بلکہ جنگ کا میدان بن جائے گا۔ کیوں کہ کسی مقام پر سیاسی اقتدار بیک وقت کسی ایک مذہبی گروہ کا ہی ہو سکتا ہے۔ پھر بقیہ دو مذہبی گروہ جن کا سیاسی قبضہ وہاں نہ ہوگا وہ قابض گروہ کے خلاف جنگ چھیڑ دیں گے۔ اس طرح یہ مقام ابدی طور پر جنگ وجدال کا مرکز بنا رہے گا۔ اس بنا پر کسی کے لئے، حتی کہ قابض گروہ کے لئے بھی یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ پرسکون طور پر وہاں اپنا عبادتی عمل انجام دے سکے۔ یروشلم کے معنی ہی امن کا شہر۔ (city of peace) کے ہیں۔ پھر کیونکر ایسا ہو کہ یروشلم کا امن ہر حال میں برقرار رہے تاکہ ہر فریق ہمیشہ اور یکساں طور پر اس کی زیارت کر سکے۔

جہاں تک اسلام کا سوال ہے، قرآن وحدیث میں یروشلم کے دو بالواسطہ حوالے ملتے ہیں۔ قرآن کی سورہ الاسراء میں معراج رسول کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے، تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں (الاسراء ۱)

روایات بتاتی ہیں کہ ہجرت سے پہلے غالباً ۶۲۲ء کے آغاز میں پیغمبر اسلام کو ایک غیر معمولی سفر کا تجربہ ہوا جس کو اسلام کی تاریخ میں اسراء اور معراج کہا جاتا ہے۔ اس سفر میں خدا کے غیبی اہتمام کے تحت آپ مکہ سے یروشلم پہنچے۔ یہاں آپ نے مسجد اقصیٰ میں باجماعت نماز ادا کی۔ واضح ہو کہ مکہ اور یروشلم کے درمیان ۸۰۰ میل کا فاصلہ ہے۔

یروشلم کا دوسرا بالواسطہ حوالہ وہ ہے جو حدیث میں آیا ہے۔ البخاری، مسلم، ابوداؤد، النسائی، الترمذی، الموطا وغیرہ میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ صرف تین مسجدیں ہیں جن کے لئے سفر کر کے جانا جائز ہے۔ مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔ آخری مسجد کے لئے بعض روایات میں مسجد ایلیاء کا لفظ ہے یعنی فلسطین کی مسجد۔ دوسری روایات میں بتایا گیا ہے کہ ان تین مسجدوں میں عبادت کرنے کا ثواب دنیا کی دوسری تمام مسجدوں سے بہت زیادہ ہے۔

ایک طرف یروشلم کی مسجد اقصیٰ کی یہ فضیلت ہے کہ اس میں عبادت کرنا مکہ اور مدینہ کی مسجد کے بعد

سب سے زیادہ افضل ہے۔ دوسری طرف قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے کسی خطہ پر سیاسی اقتدار کسی ایک ہی قوم کا قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ ہر زمانہ میں بدلتا رہے گا۔ کبھی ایک قوم کے پاس اور کبھی دوسری قوم کے پاس۔ اس بات کو قرآن (آل عمران ۱۴۰) میں ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ——— اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں (وتلك الايام نداولها بين الناس)

اب سوال یہ ہے کہ جب عام قانون فطرت کے تحت یروشلم کا سیاسی اقتدار ابدی طور پر کسی ایک قوم کے پاس نہیں رہ سکتا تو اہل اسلام کے لئے مسجد اقصیٰ میں ہر دور میں عبادت کرنے کی صورت کیا ہو۔ ہر مسلمان فطری طور پر یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ اس مسجد میں داخل ہو کر سجدہ کرے جہاں پیغمبر اسلام نے اور دوسرے تمام نبیوں نے سجدہ کیا۔ اب اگر اس عبادت کو سیاسی اقتدار سے جوڑا جائے اور یہ کہا جائے کوئی مسلمان صرف اس وقت مسجد اقصیٰ میں عبادت کرنے کی سعادت حاصل کر سکتا ہے جب کہ اس علاقہ پر مسلمانوں کی حکومت بھی قائم ہو تو ملینوں مسلمان، سابق سعودی حکمراں فیصل بن عبد العزیز کی طرح اپنے سینہ میں یہ تمنا لئے ہوئے مر جائیں گے اور اس قیمتی احساس کا تجربہ نہ کر سکیں گے کہ آج میں اس مقام پر خدائے برتر کے لئے سجدہ کر رہا ہوں جہاں پیغمبر اسلام نے تمام نبیوں کے ساتھ سجدۂ توحید ادا کیا۔

اس مسئلہ کا حل کیا ہو۔ اس کا حل خود پیغمبر اسلام کی سنت میں موجود ہے۔ اس سنت کا خلاصہ یہ ہے کہ ——— معاملہ کے سیاسی پہلو کو الگ رکھتے ہوئے اس کے عبادتی پہلو کو لے لینا۔ مسئلہ کو نظر انداز کر کے امکان کو استعمال کرنا۔ اس سنت کو ہم نے الفصل بین القضیتین کا نام دیا ہے۔ رسول اللہ کی یہ سنت حسب ذیل واقعات سے معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جولائی ۶۲۲ء میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ یہاں آپ تقریباً ڈیڑھ سال (۶۲۳ کے آخر تک) بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اور آپ کے صحابہ بھی اسی طرح عمل کرتے رہے۔ ۶۲۴ء کے آغاز میں قرآن (البقرہ ۱۴۴) میں یہ حکم اترا کہ اب تم لوگ کعبہ کو اپنا قبلۂ عبادت بنا لو اور اسی طرف رخ کر کے تمام لوگ پنج وقتہ نماز یں ادا کرو۔

جب قبلہ کی تبدیلی کا یہ حکم اترا تو اسی کے ساتھ قرآن میں یہ حکم بھی اتارا گیا کہ اے مسلمانو، تم لوگ نماز اور صبر سے مدد لو (البقرہ ۱۵۳) صبر کا ایک عام مفہوم ہے۔ مگر اس موقع پر صبر کا ایک خاص مفہوم بھی تھا۔ وہ یہ کہ جس وقت کعبہ کو قبلۂ عبادت بنانے کا حکم اترا اس وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ عملاً کعبہ اس وقت شرک کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس طرح اہل ایمان کو ایک تکدر ہو سکتا تھا کہ ہم کیوں کر ایک موحدانہ عبادت کا قبلہ ایک ایسی عمارت کو بنائیں جو عملاً شرک اور بت پرستی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ حکم دیا گیا کہ اس پہلو کو صبر کے خانہ میں ڈال دو اور حکم کی تعمیل کرو۔

تاریخ کے مطابق، یہ حالت پورے چھ سال یعنی فتح مکہ تک قائم رہی۔ تحویل قبلہ کے بعد سے چھ سال تک مسلمان اس حال میں کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز ادا کرتے رہے کہ وہاں سیکڑوں بت موجود تھے اور وہ پوری طرح شرک کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ یہ صورت حال مکہ کی فتح کے بعد ختم ہوئی جب کہ بتوں کو کعبہ سے نکال دیا گیا۔

اس سے اسلام کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ اس اصول کو الفصل بین القضیتین یا عدم الخلط بین الشیئین کہا جا سکتا ہے۔ اس اصول کے تحت کعبہ اور اصنام کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ اصنام کی موجودگی پر صبر کرتے ہوئے کعبہ کو قبلۂ عبادت بنا لیا گیا۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسرا نمونہ اسراء اور معراج کے واقعہ میں ملتا ہے۔ پیغمبر اسلام کا سفرِ معراج ہجرت سے پہلے غالباً ۶۲۲ء میں ہوا۔ اس وقت یروشلم پر مسلمانوں کی حکومت نہیں تھی۔ بلکہ وہاں مشرک ایرانیوں کا قبضہ تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۶۱۴ء میں ایرانی حکمراں خسرو پرویز نے یروشلم پر حملہ کیا اور اس کو رومیوں سے چھین لیا جو ۶۳ ق م سے اس پر قابض چلے آرہے تھے۔ ایرانی سلطنت کا سیاسی قبضہ ۶۲۹ء میں ختم ہوا جب کہ رومی حکمراں (Heraclius) نے ایرانیوں کو شکست دے کر دوبارہ یروشلم پر اپنا قبضہ بحال کیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل جس وقت اپنے سفر معراج میں یروشلم میں داخل ہوئے اور مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی اس وقت یروشلم پر ایک غیر مسلم بادشاہ خسرو پرویز کی حکومت تھی۔ اس سے یہ اہم سنت رسول معلوم ہوتی ہے کہ عبادت اور سیاست

کو ایک دوسرے سے مخلوط نہ کرنا چاہئے۔

۳۔ اس سنت نبوی کی تیسری مثال ہجرت کے بعد ۶۲۹ء میں ملتی ہے۔ اس وقت مکہ مشرکین قریش کے قبضہ میں تھا۔ اس کے باوجود آپ اپنے اصحاب کے ساتھ تین دن کے لئے مکہ میں داخل ہوئے اور وہاں عمرہ کیا اور کعبہ کا طواف کیا۔ ایسا صرف اس لئے ممکن ہوا کہ آپ نے عبادتی معاملہ کو سیاسی معاملہ کے ساتھ مختلط نہیں کیا۔ اگر آپ اس شرط کو ضروری سمجھتے کہ عمرہ کی عبادت اسی وقت کی جا سکتی ہے جب کہ مکہ پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو چکا ہو تو آپ کبھی اپنے اصحاب کے ساتھ وہاں عمرہ کے لئے داخل نہ ہوتے۔

اس سنت رسول (الفصل بین القضیتین) کی روشنی میں یروشلم کے موجودہ مسئلہ کا حل یہ ہے کہ یروشلم پر سیاسی قبضہ کے مسئلہ کو مسجد اقصیٰ میں عبادت کرنے کے سوال سے الگ کر دیا جائے۔ مسلمان خواہ فلسطین کے ہوں یا بیرونی ملکوں کے، وہ آزادانہ طور پر یہاں آکر مسجد اقصیٰ میں اللہ کے لئے عبادت کریں۔ عبادت کو سیاسی اقتدار کے ساتھ مشروط اور مخلوط نہ کیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یروشلم کے مسئلہ کا واحد عملی حل یہ ہے کہ اس معاملہ میں الفصل بین القضیتین کے مذکورہ بالا اصول کو اختیار کر لیا جائے۔ یعنی کسی نزاعی معاملہ کے دو پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا۔ یہی یروشلم کے مسئلہ کا (بالخصوص موجودہ حالات میں) واحد قابل عمل حل ہے۔ ہمیں چاہیے کہ یروشلم کے سیاسی پہلو کو اس کے مذہبی پہلو سے الگ رکھیں۔ تاکہ لوگوں کے لیے ان کی عبادت کی راہ میں کوئی نظریاتی رکاوٹ حائل نہ رہے۔ اور وہ ہر حال میں یروشلم جا کر آزادانہ طور پر اپنے عبادتی جذبہ کی تسکین حاصل کر سکیں۔

## تاریخی فرق

یروشلم پر مسلمانوں کا قبضہ پہلی بار ۶۳۸ء میں ہوا۔ اس کے بعد ۱۰۹۹ء میں دوبارہ وہ مسیحیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ۸۸ سال بعد ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ یروشلم پر مسلم قبضہ کو بحال کیا۔

اس طرح گیارھویں صدی اور بارھویں صدی کے درمیان تقریباً ۹۰ سال تک کا زمانہ

ایسا گزرا ہے جب کہ یروشلم غیر مسلموں کے سیاسی قبضہ میں تھا۔ یہ تاریخ کا وہ زمانہ ہے جب کہ مذہبی آزادی کا دور ابھی نہیں آیا تھا۔ ہر طرف دنیا میں مذہبی جبر کا نظام رائج تھا۔ چنانچہ یروشلم پر مسیحی قبضہ کے ساتھ ہی مسلمانوں کا وہاں داخلہ بھی عملاً بند ہو گیا۔ ایک عرصہ تک کے لئے مسلمان مسجد اقصیٰ کی زیارت سے محروم کر دئے گئے۔

مگر ۱۹۶۷ میں جب یروشلم یہودی قبضہ میں آیا تو زمانہ بالکل بدل چکا تھا۔ اب ساری دنیا میں مذہبی آزادی کو ہر فرد کا ناقابل تنسیخ حق مان لیا گیا تھا۔ یہ زمانی فرق اتنا طاقت ور تھا کہ یروشلم کے نئے حکمرانوں کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ مسجد اقصیٰ میں مسلمانوں کے داخلہ پر پابندی عائد کر سکیں۔

تاہم مسلمان اس جدید امکان کو استعمال نہ کر سکے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ وہ زمانی فرق کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ چنانچہ سابقہ روایت کے زیر اثر وہ یروشلم جانے سے رک گئے نئی حکومت نے کبھی انھیں یروشلم جانے سے نہیں روکا۔ بلکہ اپنے خود ساختہ تصور کے تحت انھوں نے بطور خود وہاں کا سفر کرنا ترک کر دیا۔

## عمومی انطباق

اوپر شریعت کا جو اصول (الفصل بین القضیتین) بیان کیا گیا، اس کا تعلق صرف یروشلم یا بیت المقدس سے نہیں ہے۔ وہ ایک عام شرعی اصول ہے اور وہ زندگی کے ہر نزاعی مسئلہ پر چسپاں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس طرح اس شرعی اصول سے ناواقفیت کی بنا پر مسلمان مسلسل طور پر ایک عظیم نعمت (مسجد اقصیٰ میں داخل ہو کر وہاں نماز ادا کرنا) سے محروم ہو رہے ہیں۔ اسی طرح وسیع تر اجتماعی زندگی میں اس اصول کو ملحوظ نہ رکھنے کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان ساری دنیا میں زبردست نقصان سے دوچار ہو رہے ہیں۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے ہر جگہ دینی اور دعوتی سرگرمیوں کے مواقع کھول دئے ہیں۔ مگر مسلمان ان قیمتی مواقع کو استعمال کرنے سے محروم ہیں۔ اس کا واحد سب سے بڑا سبب الفصل بین القضیتین کے شرعی اصول کو ملحوظ نہ رکھنا ہے۔

اس اصول کا تقاضا تھا کہ مسلمان دینی پہلو اور سیاسی پہلو کو الگ الگ رکھتے۔ وہ سیاست کو اس کے مخصوص دائرہ میں رکھتے ہوئے دینی اور دعوتی امکانات کو بھرپور طور پر استعمال کرتے

مگر وہ ہر جگہ مکمل اسلامی انقلاب کے نام پر سیاسی حکمرانوں سے ٹکرا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور جدید کے بہترین امکانات استعمال ہونے سے رہ گئے اور مسلمانوں کے حصہ میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ آیا۔

مسلمانوں کے ایک طبقہ میں آجکل ایک جملہ بہت دہرایا جارہا ہے: الاسلام دین ودولة۔ یعنی اسلام مذہب بھی ہے اور حکومت بھی۔ اسی پس منظر میں ایک بیرونی سفر میں کچھ عرب نوجوانوں نے مجھ سے سوال کیا کہ مذہب اور حکومت کی علیحدگی کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے (ما رأيك عن الفصل بين الدين والدولة)

میں نے کہا: اما كعقيدة فلا، واما كضرورة عملية فنعم۔ یعنی عقیدہ کے طور پر تو دونوں میں کوئی فصل نہیں، مگر عملی ضرورت کے طور پر یقیناً دونوں میں فصل ہوتا ہے۔

عقیدہ یا نظریہ ہمیشہ آئیڈیلزم کے اصول پر بنایا جاتا ہے۔ مگر جہاں تک عملی کورس کا تعلق ہے وہ ہمیشہ وقت کے حالات وضروریات کے تابع ہوتا ہے۔ یہ ایک عام اصول ہے جو کسی استثناء کے بغیر زندگی کے تمام معاملات سے متعلق ہے۔ اور اسی طرح اس کا تعلق اسلام سے بھی ہے۔ اعتقادی طور پر بلاشبہ اسلام میں مذہب اور سیاست دونوں شامل ہیں۔ مگر جب عمل کا منصوبہ بنانا ہو تو وقت کے حقیقی حالات کو ملحوظ رکھنا لازمی طور پر ضروری ہوگا۔

عقیدہ اور عمل کے اسی فرق کی بناپر اسلام میں کسی قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کو حرام قرار دیا گیا ہے، خواہ وہ حکومت بظاہر غیر اسلامی ہو، اور خواہ اس کے خلاف سیاسی اقدام کرنے والے بظاہر اسلام کے دعاوی کو لے کر اٹھے ہوں۔ کیوں کہ عملی نتیجہ کے اعتبار سے اس قسم کا اقدام فتنہ اور ظلم میں اضافہ کا سبب بنے گا۔ وہ اس کو ختم کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

یہ ناموافق عملی حالات مختلف قسم کے ہوسکتے ہیں۔ مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ حکومت اتنی طاقت ور اور مستحکم ہو کہ دکھائی دیتا ہو کہ وہ اسلام کے علمبرداروں کو کچل ڈالے گی۔ حتی کہ وہ ایسے انقلابیوں کی پیدائش کو روکنے کے لئے مسجد، مدرسہ، صحافت، تعلیمی نظام اور دوسرے تمام اداروں پر اپنا سخت کنٹرول قائم کرکے ملے ہوئے مواقع کا بھی خاتمہ کر دے گی۔ اس کا جو ظلم پہلے مخصوص دائرہ تک محدود تھا، وہ عمومی طور پر پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

اس نوعیت کے تباہ کن اقدامات کی مثالیں کشمیر، چیچنیا، بوسنیا، برما، فلپائن، مصر، الجزائر وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان علاقوں میں اسلام کے نام پر جو عملی اقدام کیا گیا وہ صرف تباہی میں اضافہ کا سبب بنا۔ وہ کسی بھی اسلامی نتیجہ تک پہنچانے والا ثابت نہیں ہوا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معاشرہ میں قبولیت کا مادہ نہ پایا جاتا ہو۔ اس لئے بظاہر عملی کامیابی کے باوجود تمام قربانیاں بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں۔ اس معاملہ کی مثالیں پاکستان اور افغانستان اور ایران میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان ملکوں میں ہنگامہ خیز اقدامات کے ذریعہ سیاسی تبدیلی لائی گئی۔ تاکہ مذہب اور حکومت کو ایک کیا جاسکے۔

مگر حقیقی نتیجہ کیا ہوا۔ جب سیاسی تبدیلی وقوع میں آچکی تو معلوم ہوا کہ مذہب اور سیاست کی یکجائی والا مطلوب نظام بنانا ممکن ہی نہیں۔ کیوں کہ معاشرہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ پاکستان اسی قسم کے نعرہ پر بنایا گیا تھا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو وہاں خود غرضی، مادہ پرستی اور باہمی جھگڑوں کا راج قائم ہو گیا نہ کہ اسلام کا راج۔ اسی طرح افغانستان میں بے پناہ قربانیوں کے ذریعہ سیاسی حکمرانوں کو بدلا گیا۔ مگر جب سیاسی نشانہ حاصل ہو چکا تو اس کے بعد جو ہوا وہ یہ تھا کہ افغانستان کے مختلف قبائلی لیڈر آپس میں لڑ کر پورے ملک کو تباہ کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ اسی طرح ایران میں عالمی شور وغل کے تحت سیاسی تبدیلی لائی گئی۔ اس تبدیلی کو ایک عرصہ تک پروپگنڈے کے زور پر اسلامی ثابت کیا جاتا رہا۔ مگر جب پروپگنڈے کا زور گھٹا تو معلوم ہوا کہ ایران میں چونکہ مطلوب انداز کا معاشرہ تیار نہ تھا اس لئے نام نہاد انقلاب نے ملک کی تباہی میں اضافہ کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام نہیں دیا۔

یہ مثالیں خلیفہ چہارم حضرت علی کے ایک قول کو یاد دلاتی ہے۔ ان کے زمانہ خلافت میں اسلامی دنیا میں زبردست خلفشار برپا ہو گیا۔ ان سے کسی نے کہا کہ ابو بکر و عمر کے زمانہ میں مسلم دنیا کے حالات درست تھے، آپ کے زمانہ میں حالات بگڑ گئے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ حضرت علی نے جواب دیا: ان ابابکر و عمر کانا والیین علی مثلی وانا وال علی مثلکم (ابو بکر و عمر میرے جیسے لوگوں کے اوپر حاکم تھے، میں تمہارے جیسے لوگوں کے اوپر حاکم ہوں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ جیسے حکمراں ہوں تب بھی ضروری ہے کہ معاشرہ میں امثال علی بڑی

تعداد میں موجود ہوں۔ اگر معاشرہ میں علیؓ جیسے افراد نہ ہوں تو صحابی کی حکومت کے باوجود حقیقی معنوں میں کوئی بہتر نظام قائم کرنا ممکن نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین اور حکومت دونوں اگرچہ اعتقادی طور پر ایک ہیں مگر عملی تقاضے کے تحت دونوں کو الگ الگ دیکھنا ہوتا ہے۔ ایک حصہ دین کا وہ ہے جس کی تعمیل فرد کی اپنی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔ ایسے احکام ہر وقت ہر فرد پر فرض رہیں گے۔ افراد کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ہر حال میں اس کی تعمیل کریں۔

دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو عمل میں لانے کا انحصار اجتماعی حالات اور اجتماعی مرضی پر ہوتا ہے۔ احکام دین کے اس دوسرے حصہ میں پہلے اس کے موافق اجتماعی ارادہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

"اسلام میں دین اور سیاست ایک ہیں" کا نعرہ لگا کر اگر کوئی شخص پہلے ہی مرحلہ میں اجتماعی قوانین کے نفاذ کی مہم چلائے۔ یا حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے تاکہ وہ بااقتدار ہو کر اجتماعی قوانین کو نافذ کر سکے، تو ایسے اقدامات سراسر غیر اسلامی اور غیر مطلوب ہوں گے۔ ایسا ہر اقدام اپنے نتیجہ کے اعتبار سے فساد پیدا کرنا ہے نہ کہ احکام اسلامی کا نفاذ کرنا۔

عقیدہ اور عمل میں برائے ضرورت تفریق کا یہ معاملہ کسی نہ کسی اعتبار سے سارے اسلامی احکام میں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ اور حج کو عقیدہ کے اعتبار سے فرض سمجھے۔ مگر ان کی عملی ادائیگی کی ذمہ داری صرف اس شخص کے اوپر ہے جو اس کی عملی شرطوں پر پورا اترتا ہو۔ اس لئے الفصل بین القضیتین کی حکمت سارے ہی دینی معاملات میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ مصائب اور مشکلات کا شکار ہیں۔ وہ اس کی ذمہ داری دشمنان اسلام کے اوپر ڈال رہے ہیں جنھوں نے اپنی سازشوں کے ذریعہ انھیں اس حالت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مگر یہ ایک لغو بات ہے۔ حتیٰ کہ وہ خود اسلام کی تردید ہے۔ کیوں کہ قرآن وحدیث کے مطابق، خدا اہل ایمان کا مددگار ہوتا ہے۔ پھر کیوں کر ایسا ممکن ہے کہ اہل کفر اہل اسلام کو اپنی سازشوں کا نشانہ بنائیں اور خدا اہل اسلام کی حمایت نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان آج جن مشکل حالات میں گھر گئے ہیں وہ یقینی طور پر مصنوعی ہیں۔ یہ الفصل بین الفقتین کی سنت رسول کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے بطور خود یہ نظریہ بنایا کہ جب تک سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو اس وقت تک دین پر بھی عمل نہیں ہو سکتا۔ اس غلط مفروضہ کی بنا پر ہر جگہ انھوں نے غیر ضروری طور پر سیاسی حکمرانوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہترین دینی امکانات استعمال ہونے سے رہ گئے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں موجودہ مسلمانوں کا ترقی کا سفر رک گیا ہے۔ مسلمان آج یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا راستہ ہر طرف سے بند ہے۔ مگر اس دنیا میں کبھی کسی گروہ کے لئے راستہ بند نہیں ہوتا۔ البتہ بعض اوقات وہ گروہ خود اپنی نادانی سے اپنا راستہ بند کر لیتا ہے۔

یہی آج مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ مسلمان مذکورہ سنت رسول پر عمل نہ کر سکے۔ انھوں نے دین کے معاملہ کو سیاسی اقتدار کے معاملہ سے الگ نہیں کیا۔ وہ ہر جگہ حکمراں طبقہ سے ٹکرا گئے۔ کیوں کہ انھوں نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا کہ جب تک اقتدار پر قبضہ نہ ہو، دین کے اوپر مکمل طور پر عمل نہیں ہو سکتا۔

یہ بلاشبہ ایک وسوسہ ہے نہ کہ کوئی دینی حقیقت۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ دینی معاملہ کو سیاسی اقتدار کے سوال سے الگ کر دیں۔ اور اقتدار کی تبدیلی سے پہلے جو مواقع انھیں حاصل ہیں، ان کو بھرپور طور پر استعمال کریں۔ اس حکمت نبوی پر عمل کرتے ہی وہ دیکھیں گے کہ ان کے لئے تمام دروازے کھل گئے ہیں، زندگی کا کوئی بھی دروازہ ان کے اوپر بند نہیں۔

درجن سے زیادہ سوال کئے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ میں ہر سوال کا جواب انگریزی میں دیتا تھا اور ڈاکٹر اندریا دلو کا اس کو اطالوی زبان میں کہتے تھے۔ لوگوں نے اس پروگرام سے بے حد خوشی کا اظہار کیا۔

مندوبین میں میرے اور ثانی اثنین کے سوا سب کے سب عیسائی تھے۔ ان کے سوالات سب کے سب وہ تھے جو غیر مسلم کے ذہن میں اسلام کے بارہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ لوگوں کے تاثر سے اندازہ ہوا کہ اللہ کی توفیق سے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب ان کو ملا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلام میں روزانہ کی عبادت کیا ہوتی ہے۔ میں نے نماز کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ میں سے کسی نے کبھی کسی مسلمان کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ سب نے کہا کہ نہیں۔ پھر میں نے نماز کا مختصر تعارف کرایا اور اس کے بعد اسٹیج پر کھڑے ہو کر ایک رکعت مکمل طور پر عملی صورت میں ادا کی۔

ایک خاتون نے کہا کہ اسلام نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک عزت اور احترام اور حقوق کا تعلق ہے تو اسلام میں عورت اور مرد کا درجہ یکساں ہے۔ البتہ دونوں میں حیاتیاتی فرق کی بنا پر دونوں کا ورک پلیس الگ الگ رکھا گیا ہے۔ مزید سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے حج کی مثال دی۔ میں نے کہا کہ حج کا ایک رکن صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا ہے۔ یہ دوڑنا ایک عورت کے طریقہ کی پیروی ہے۔ تمام حاجی خواہ وہ امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا رعایا، سب کے سب یہاں عورت کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "عورت پہلے" کے اصول کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شاندار انداز میں اسلام میں قائم کیا گیا ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ انڈیا میں مسلمانوں کا حال کیسا ہے۔ میں نے کہا کہ انڈیا میں مسلمان آزاد ہیں اور وہاں ہر قسم کی اسلامی سرگرمیاں آزادانہ طور پر جاری ہیں۔ کسی بھی اسلامی معاملہ میں کوئی پابندی نہیں۔

مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ نے شاید بابری مسجد کو ڈھائے جانے کا قصہ اخبار میں پڑھا ہو۔ کیوں کہ میڈیا نے اس کا بہت زیادہ پرچار کیا۔ مگر یہی کل بات نہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عسر کے ساتھ یسر بھی موجود رہتا ہے۔ یعنی

ڈس ایڈوانٹج کے ساتھ یہاں ایڈوانٹج بھی ضرور پایا جائے گا۔ اور انڈیا یقینی طور پر کوئی مستثنیٰ ملک نہیں۔ چنانچہ انڈیا میں اگر ایک بابری مسجد ڈھائی گئی ہے تو اس کے بعد بھی انڈیا میں ساڑھے تین لاکھ مسجدیں باقی ہیں۔ اور وہاں پوری آزادی کے ساتھ عبادت کا عمل کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈیا میں اگر ایک عسر ہے تو عین اسی وقت وہاں یسر کی تعداد ساڑھے تین لاکھ ہے۔ اس لئے ہمارے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

مرکز کے اس اجتماع میں ایک اطالوی نوجوان بھی موجود تھا۔ ان سے پہلی ملاقات یہیں ہوئی وہ سائنس کے مضمون میں پوسٹ گریجویٹ کا کورس کر رہے ہیں۔ وہ ایک سادہ فطرت نوجوان تھے۔ اسلام سے کچھ واقفیت ہوئی۔ اس سے وہ متاثر ہو گئے۔ اب وہ اسلام کے برحق ہونے پر پوری طرح مطمئن ہیں۔ ان کے کمرہ میں اسلامی کتابیں سب سے زیادہ نظر آتی ہیں۔

وہ ابھی تک اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی ماں کٹر مسیحی ہیں۔ ان کے اندر تڑپ ہے کہ وہ باقاعدہ نماز ادا کریں۔ انھیں اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے نماز پڑھنا شروع کیا تو ان کی ماں سخت ناراض ہوں گی اور پھر اس کے بعد انھیں غیر معمولی مشکلات پیش آئیں گی۔

کسی مسلمان سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس نے ان کا کیس سننے کے بعد کہا کہ جب آپ اسلام کو اپنا مذہب مان چکے ہیں تو اب تمہارے لئے نماز پڑھنا ضروری ہے ورنہ تم جہنم میں جاؤ گے۔

وہ نوجوان اس سے بہت گھبرایا ہوا تھا۔ مجھ سے گفتگو ہوئی تو میں نے کہا کہ مذکورہ مسلمان نے آپ کو غلط بتایا۔ قرآن میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ انسان کے اوپر بقدر استطاعت ذمہ داری ہے۔ آپ کو جب موقع ہو پردہ میں نماز پڑھ لیں۔ مگر اعلان کے ساتھ آپ نماز نہ پڑھیں۔ فی الحال سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آپ کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ کہیں بھی رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کے لئے اس قسم کا مسئلہ نہیں رہے گا۔

مذکورہ قسم کے مسلمانوں کے بارہ میں کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ وہ مسائل فقہ کو جانتے ہیں۔ مگر وہ مسائل دعوت کو نہیں جانتے۔

مغرب کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان بودساموت الحسین (۱۹۶۴) سے ملاقات ہوئی۔ ان کا اصل

نام الحسین ہے اور بودساموت خاندانی لقب ہے۔ دوسرے ملکوں میں خاندانی نام آخر میں ہوتا ہے اور مغرب میں فرانس کے اثر سے پہلے لکھا جاتا ہے۔ جیسے کہ میرا نام وحید الدین خاں لکھا جاتا ہے۔ مغرب کے اصول پر لکھنا ہو تو اس کو خاں وحید الدین لکھا جائے گا۔

بودساموت الحسین بولونیا میں رہتے ہیں جو میلان سے تین سو کیلومیٹر دور اٹلی کا ایک شہر ہے۔ پچھلی شام کو انھوں نے ٹی وی پر مجھ کو گورباچیف سے ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھا۔ اس سے انھیں معلوم ہوا کہ اس وقت میں میلان میں ہوں۔ وہ رات کو سفر کرکے صبح سویرے میلان پہنچے۔ اور ہوٹل میں مجھ سے ملاقات کی۔

انھوں نے بتایا کہ میں اطالویوں میں دعوت کا کام کر رہا ہوں۔ مگر اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود مسلمان ہیں۔ نام نہاد مسلم جماعتوں کے لوگ یہاں ہر شہر میں موجود ہیں۔ وہ صرف ایک کام میں مشغول ہیں۔ مسلم حکمرانوں کے خلاف لوگوں کے جذبات ابھار کر مال جمع کرنا اور لیڈری حاصل کرنا۔ خالص دعوت کے کام کو وہ پسند نہیں کرتے کیوں کہ اس میں انھیں اپنی جڑ کٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک میں بہت سے لوگ حق کے متلاشی ہیں۔ مگر وہ ان کے لئے ہدایت کا دروازہ بند کر رہے ہیں (وبهذا المنهج المنحرف يتم اغلاق ابواب الهداية عوض فتحها امام الباحثين عن الحق، وما اكثرهم)

میں نے کہا کہ آپ نے صحیح کہا۔ اسلامی تحریکات کے نام پر آجکل جو جماعتیں ہر جگہ کام کر رہی ہیں وہ اپنے منحرف فکر کی بنا پر صحیح اسلام کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں۔ مگر آپ جیسے لوگوں کے لئے مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ دشواریوں کے اضافہ سے اجر میں اضافہ ہوتا ہے (مع كثرة العراقيل يزداد الاجر)

ایک پروگرام میں شنتو مذہب کے عبادتی پروگرام کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک شخص سیدھا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ باندھے۔ اس کے بعد وہ چند بار رکوع کے انداز میں جھکا۔ اس کے بعد چھوٹی سی کتاب لے کر اس سے پڑھنا شروع کیا۔ غالباً یہ دعا کی کتاب تھی۔

دوسرے مذاہب کی عبادت میں جھکنا ہے مگر سجدہ نہیں ہے۔ جھکنا اطاعت کی علامت ہے اور سجدہ قربت کی علامت۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی عبادتیں اطاعت کا سبق دیتی ہیں مگر

وہ آدمی کو قربت خداوندی کا تجربہ نہیں کراتیں۔ یہ اسلام کی خاص صفت ہے، جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے واسجد واقترب۔

۲۲ ستمبر کی صبح کو اٹالین ٹی وی نے انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق انڈیا میں اسلام اور مسلمانوں سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ انڈیا میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کے مواقع موجود ہیں۔ اخباروں میں جو باتیں آتی ہیں وہ حقیقت سے زیادہ مبالغہ ہیں۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ اجودھیا کی مسجد مسلمانوں نے کھودی۔ مگر عین اسی زمانہ میں دہلی میں دو درجن مسجدیں غیر مسلموں کے قبضہ میں تھیں اور ان مسجدوں کو مسلمان دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس فرق کا سبب طریق کار کا فرق ہے۔ اجودھیا میں مسلم لیڈروں نے اپنی تحریک ٹکراؤ کے انداز میں چلائی اور دہلی کی مسجدوں کو واگزار کرانے کی تحریک پرامن انداز میں چلائی گئی طریق عمل کے اسی فرق کی وجہ سے مسلمانوں نے اجودھیا کی مسجد کھودی۔ اور دہلی کی مسجدوں کو حاصل کرلیا۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اسلام کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن جدید دنیا کے لئے "ایک خدا اور ایک انسان" کا نظریہ ہے۔ یہ نظریہ ایک طرف آدمی کو صحیح ڈائرکشن دیتا ہے، اور دوسری طرف تمام انسانوں کو یکساں بنیاد پر متحد کرتا ہے۔

میلان میں ایک اور پرائیویٹ ٹیلیویژن (Telè Chiara) نے انٹرویو لیا۔ یہ کیتھولک ٹی وی کہا جاتا ہے۔ اس کا پورا نام یہ ہے:

Gestione Telecomunicazioni S.R.L.

انھوں نے مختلف سوالات کئے۔ میں نے انگریزی میں جواب دیا جس کا ترجمہ ڈاکٹر اندریا دلوکا (روم) اطالوی زبان میں کرتے رہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ پیس کانفرنس کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ عالمی پراسس کا ایک حصہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں ایک پراسس جاری ہوا ہے۔ ساری دنیا جنگ اور ٹکراؤ کے راستہ کو چھوڑ کر امن کے راستہ کی طرف جا رہی ہے۔ یہ ایک عالمی پراسس ہے جو انسانی تاریخ میں جاری ہوا ہے۔ موجودہ کانفرنس اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح کا پراسس جب تاریخ میں جاری ہو جائے تو لازمی طور پر وہ اپنے نتیجہ تک پہنچ کر رہتا ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میں مشکلات کو چیلنج کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ اسی لئے مجھے مشکلات کو دیکھ کر پریشانی نہیں ہوتی۔ قدرت نے ہماری ترقی کے لئے یہی راستہ مقرر کیا ہے۔ چیلنج نہیں تو ترقی بھی نہیں۔

میلان میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور میں وینس (Venice) میں رہتا ہوں۔ انھوں نے اپنا نام ———— ایلی مینا ٹو دی الا (illuminatto de Alla) بتایا۔ یہ نام مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ یہ اصل نام کا اطالوی زبان میں ترجمہ ہے۔ میرا اصل نام ظہور احمد ہے۔

نام کے ترجمہ کا یہ طریقہ بہت عجیب ہے۔ یہ خطرناک بھی ہے۔ کیوں کہ چند نسلوں کے بعد ایسے لوگوں کا تشخص ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ اسی کلچر میں ضم ہو جائیں گے جس کے زیر اثر انھوں نے اپنے نام کا یہ ترجمہ کیا تھا۔

۲۲ ستمبر کی شام کا کھانا "بشپ ہاؤس" میں تھا۔ یہ ایک محل نما عمارت ہے جو کئی سو سال پہلے بنائی گئی تھی۔ اس میں بشپ کی رہائش گاہ اور اس کے دفاتر واقع ہیں۔

۲۳ ستمبر کو میلانو سے واپسی تھی۔ فجر کی نماز یہاں کے ہوٹل میں پڑھی اور صبح سات بجے اپنے کمرہ سے نکلا۔ اس وقت بے اختیارانہ طور پر زبان پر یہ دعا جاری ہوگئی اَللّٰھُمَّ اَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّي مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا

میلانو ایئر پورٹ پر پہنچنے میں بعض اتفاقی اسباب سے دیر ہوگئی۔ ہماری فلائٹ روانہ ہوگئی اور ہم اس پر سوار نہ ہو سکے۔ دوسری فلائٹ میں ہمارا نام ویٹنگ لسٹ میں تھا۔ وہ بھی نہ مل سکی۔ آخر تین گھنٹہ کی تاخیر سے تیسری فلائٹ لی گئی۔ اب یہ سوال تھا کہ لندن میں جو لوگ ہماری رہنمائی کے لئے آنے والے تھے ان سے ہم کیسے مل سکیں گے۔ اس احساس کو لئے ہوئے ہم برٹش ایئرویز کی فلائٹ ۲۳/۵۶۵ کے ذریعہ لندن ایئرپورٹ پر اترے تھے۔

میلان سے لندن کے راستہ میں لندن کا اخبار ٹائمس (The Times) کا شمارہ ۲۳ ستمبر ۱۹۹۳ دیکھا۔ اس شمارہ کے ساتھ ۱۶ صفحہ کا تین رنگ میں چھپا ہوا ضمیمہ شامل تھا جس کا نام سعودی عرب (Saudi Arabia) تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پچھلے چند برسوں کے حالات کے نتیجہ میں

سعودی عرب میں "ماڈرنائزیشن" کا عمل تیزی سے جاری ہوگیا ہے جو یہاں کے ہر شعبہ میں محسوس طور پر نظر آتا ہے۔ ایک مضمون کا عنوان تھا:

Arabs count the cost of peace.

اس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۹۷۹ میں ایران کے "اسلامی ریولیوشن" کے بعد سعودی عرب پہلے سے زیادہ امریکہ پر (dependent) ہوگیا۔ کیوں کہ اس انقلاب کے بعد ایران اسلامک ورلڈ کی لیڈر شپ حاصل کرنے کے لئے سعودیہ کا حریف بن گیا تھا۔ اب ویسٹرن ٹکنالوجی کے لئے ریاض کی ضرورت بہت بڑھ گئی۔ سعودی عرب ساری دنیا کے مسلمانوں کو بہت بڑی مالی امداد دیتا ہے۔ ۱۹۹۲ میں سعودیہ نے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کو ۸۰۰ ملین پونڈ دئے۔ عراق۔کویت جنگ میں سعودیہ نے ۳۷ بلین پونڈ خرچ کیا۔

سعودیہ نے اس سے پہلے عراق کی بڑے پیمانہ پر مالی مدد کی تھی۔ مگر ۱۹۹۲ میں جب سعودیہ پر عراقی میزائل (scud missiles) گرنے لگے تو معلوم ہوا کہ پیسہ اچھے تعلقات کے لئے کافی نہیں۔

اردن اور پی ایل او کو سعودی عرب سے بہت بڑی مالی امداد مل رہی تھی۔ مگر دونوں نے عراق کا ساتھ دیا۔ یمن کا بہت بڑا اقتصادی انحصار سعودی عرب پر تھا مگر وہ بھی عراق کا ساتھی بن گیا۔ اس پورے علاقہ میں ایران کا خطرہ ایک مستقل مسئلہ تھا۔ ان چیزوں نے سعودی عرب کو اس قطعی رائے تک پہنچا دیا کہ وہ عربوں یا مسلم ملکوں کے مقابلہ میں مغربی ٹکنالوجی کے ذریعہ اپنے آپ کو زیادہ محفوظ بنا سکتے ہیں۔

مغربی پریس کتنی مہارت کے ساتھ چیزوں کو پیش کرتا ہے، اس کی ایک مثال ٹائمس کا صفحہ ۴ کا ایک مضمون تھا۔ اس مضمون کے اوپر ایک تصویر دی گئی تھی جس کو ہم اس صفحہ کے نیچے نقل کر رہے ہیں۔ فلسطین کے ایک بے حد چھوٹے سے علاقہ میں اسرائیل نے فلسطینیوں کو محدود آزادی (limited autonomy) کا حق دیا ہے۔ یہاں فلسطینیوں نے ایک سرحدی دیوار پر جلی حرفوں میں یہ لکھ دیا ہے: پی ایل او کی مملکت میں خوش آمدید۔ اس کے ساتھ کیپشن میں لکھا ہوا تھا کہ شرق اوسط کی تاریخ کے ایک نازک موقع پر، تیل کی گرتی ہوئی قیمتوں اور خلیج کی جنگ کی قیمت نے سعودیوں اور فلسطینیوں کو نوشتۂ دیوار پڑھنے پر مجبور کر دیا ہے۔

فلسطینی سمیت پوری مسلم دنیا ستمبر ۱۹۹۳ سے پہلے فلسطین سے اسرائیلی حکومت ختم کرنے سے کم کسی بات کو سننے پر راضی نہ تھی۔ مگر آج اس کے محدود ٹکڑے پر وہ خوش آمدید کے الفاظ رقم کر رہے ہیں۔ شعوری فیصلہ کے تحت وہ حقیقت پسندی کو اختیار نہ کر سکے۔ مگر حالات کے دباؤ نے انھیں حقیقت پسندی کی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہی ساری دنیا میں مسلمانوں کا حال ہے۔ فیصلہ صرف وہ ہے جو شعور اور ارادہ کے تحت ظہور میں آیا ہو۔ دباؤ کے تحت کیا جانے والا فیصلہ کوئی فیصلہ نہیں۔ اور نہ ایسے فیصلہ کا کوئی دور رس نتیجہ کبھی برآمد ہو سکتا ہے۔

۲۲ ستمبر کو دو بجے لندن پہنچا۔ جہاز سے اتر کر ایئر پورٹ پر چلتے ہوئے ایک جگہ تین دروازے بنے ہوئے تھے۔ دو دروازوں پر لکھا ہوا تھا:

European Community Nationals

اور ایک کنارے کے دروازہ پر یہ الفاظ تھے:

All other passports

یہ صرف گزرگاہ کے لئے تھا۔ انتظامی ضرورت کے تحت ایسی تقسیم میں کوئی حرج نہیں مگر مجرد گزرگاہ کے لئے یہ تقسیم racism کی طرف لے جاتی ہے۔

جس فلائٹ سے ہمیں لندن پہنچنا تھا چوں کہ وہ میلان میں چھوٹ گئی اور ہم دوسرے جہاز سے لندن پہنچے۔ اس لئے لندن ایئر پورٹ پر جو لوگ ہماری رہنمائی کے لئے آئے تھے وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ اب ہمارے سامنے سوال یہ تھا کہ ان سے کس طرح ربط قائم کیا جائے۔ ہم نے برمنگھم میں جناب شمشاد خاں صاحب کو خبر دی کہ ہم لندن ایئر پورٹ پر ہیں۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ لندن کے ساتھیوں نے بھی شمشاد خاں صاحب سے برائے معلومات ربط قائم کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم لندن ایئر پورٹ پر پہنچ چکے ہیں۔ چنانچہ وہ دوبارہ ایئر پورٹ پر آئے اور آگے کے لئے ہماری رہنمائی کی۔ کیوں کہ ہمیں بذریعہ ٹرین وگن پہنچنا تھا۔

۲۳ ستمبر کی دوپہر کو ہم برٹش ریلوے اسٹیشن ایوسٹن (Euston) پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ٹرین جلد ہی آنے والی تھی جس کے ذریعہ ہمیں وگن جانا تھا۔ اتنے میں پولیس کی وردی میں کلی

آدمی ظاہر ہوئے۔ انھوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا۔ آپ لوگ اسٹیشن چھوڑ دیں۔ تمام لوگ اپنا سامان لے کر باہر آگئے۔ پولیس والے مزید ان کو دور رہنے کی ہدایت کرتے رہے۔ آخر کار دور کے ایک فاصلہ پر سب لوگ جمع ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ کسی نے ٹیلیفون پر بم کی اطلاع کر دی۔ کچھ دیر کے بعد پولیس والوں نے ہری جھنڈی دکھائی اور تمام لوگ دوبارہ اسٹیشن کے اندر آگئے۔ تاہم اس درمیان میں ہماری پہلی گاڑی چھوٹ چکی تھی۔

اکثر افواہیں غلط ہوتی ہیں۔ یہ بار بار کا تجربہ ہے۔ اس کے باوجود ہر افواہ پر لوگ دوڑ پڑتے ہیں۔ ہر افواہ کو صحیح گمان کر لیتے ہیں۔

میں اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک روشن بورڈ پر نظر پڑی۔ اس پر لکھا ہوا تھا ـــــ کیا آپ کا مقصد بزنس میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ اس وقت آپ اپنے نشانہ سے صرف دو سو میل کے فاصلہ پر ہیں:

Aiming for business success?
Right now you're about 200 miles off target.

وگن میں میرا قیام ایک عرب نوجوان کے مکان پر تھا۔ یہ مکان انھوں نے ایک ہفتہ کے لئے خالی کر دیا تھا۔ یہاں نصف درجن نوجوان جمع تھے۔ ان کے ساتھ دن اور رات کو مجلس کی صورت میں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ گفتگو کی صورت یہ تھی کہ میں اپنی بات عربی میں کہتا تھا جس کو وہ لوگ بیک وقت ٹیپ ریکارڈر پر ٹیپ کرتے رہتے تھے اور ساتھ ہی کاغذ پر لکھتے جاتے تھے۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد میں ان کی لکھی ہوئی تحریر کو سنتا تھا۔ اگر اس میں کوئی تعبیری فرق ہوتا تو اس کو درست کر دیتا۔ اس طرح یہ سلسلہ ۲۳ ستمبر کی شام سے آخر وقت تک مسلسل جاری رہا۔

اس درمیان بہت سی دینی و ملی و تاریخی باتیں زیر بحث آئیں۔ کثیر تعداد میں سوالات ہوئے جن کا جواب میں دیتا رہا۔ خود میرے پاس تو اس کا ریکارڈ موجود نہیں مگر ان عرب نوجوانوں کے پاس تمام چیزوں کا مکمل ریکارڈ ٹیپ یا تحریر کی صورت میں موجود ہے۔ وہ لوگ ان کو دوبارہ مرتب کر کے دوسرے عرب نوجوانوں تک پہنچائیں گے۔ ان ملاقاتوں میں میری خاص کوشش یہ رہی کہ دور جدید کے اعتبار سے اسلام کو واضح کروں اور لوگوں کو یہ بتاؤں کہ اسلام

کا اصل اقدامی عمل دعوت ہے۔

وگن (Wigan) برطانیہ کا ایک شہر ہے جو گریٹر مانچسٹر میں شامل ہے۔ وہ دریائے ڈگلس کے کنارے واقع ہے۔ وہ رومن عہد میں ۱۱۰۰ء میں بنایا گیا۔ اٹھارویں صدی میں صنعتی دور کا آغاز ہوا تو اس کے بعد وگن کو کافی ترقی ہوئی۔ یہاں کوئلہ اور کپاس اور لوہے کی صنعتیں قائم ہوئیں۔

مغرب کا فیملی اسٹرکچر ہندستان کے فیملی اسٹرکچر سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان کا بچہ "ہم" کی اصطلاح میں سوچتا ہے، جب کہ مغرب کا بچہ "میں" کو جانتا ہے۔ مغرب کے بچہ کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ میں ہی سب کچھ ہوں:

'I' am the only one who matters.

مغرب کا پورا ماحول اسی آزادانہ انفرادیت کا مبلغ ہے۔ آزادی یا انفرادیت بذات خود غلط نہیں۔ مگر ہر چیز اپنی حد سے تجاوز کرنے کے بعد غلط ہو جاتی ہے۔ اور مغرب اس معاملہ میں آخری حد سے بھی زیادہ تجاوز کر چکا ہے۔ بظاہر حالات مستقبل قریب میں اس کی واپسی کا امکان نہیں۔

مغربی ملکوں میں جو مسلمان آباد ہیں ان کی تعداد تقریباً ۱ ملین ہے۔ ان میں سے نصف تعداد یورپ میں ہے اور نصف تعداد شمالی امریکہ میں۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ کے اکابر نے اس نام پر قربانی دی کہ مغرب ہمارا دشمن ہے۔ اس کو مسلم ملکوں سے نکالنا ضروری ہے۔ مگر بے شمار قربانی کے بعد جب ان مغربی قوموں کا سیاسی اخراج ہو گیا تو ان اکابر کی اگلی نسل خود ہی دوڑ کر اہل مغرب کے ملکوں میں جا بسی۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کے اکابر غلط تھے یا آپ لوگ غلطی کر رہے ہیں۔ وہ صاحب دونوں ہی کو صحیح ثابت کرتے رہے۔ یہی دو طرفہ سوچ ہے جو صحیح تفکیر میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اعتراف صحیح تفکیر کی لازمی شرط ہے۔ جس آدمی کے اندر اعتراف کا حوصلہ نہیں، وہ تفکیر صحیح سے بھی یقینی طور پر محروم رہے گا۔

ایک صاحب نے کہا کہ مغرب والوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انھیں ہر چیز میں اول (first in everything) بنے رہنا ہے۔ اس اسپرٹ کو زندہ رکھنے کے لئے انھیں طاقت ور حریف (strong opponent) کی ضرورت ہے۔ پہلے کمیونزم یہ کام کر رہا تھا۔ اب کمیونزم کے خاتمہ کے بعد انھوں نے اسلام کو اپنا حریف بنالیا ہے۔ اب وہ اسلام کا فرضی یا حقیقی خطرہ بتا کر مذکورہ اسپرٹ

کو اپنے لوگوں میں باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اگر بالفرض ایسا ہو تو یہ وہی ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمان ان سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ پاکستان والے ہندستان کے خطرہ پر اپنے قومی جذبہ کو زندہ کئے ہوئے ہیں۔ عرب دنیا صہیونی خطرہ کو اپنی حیات قومی کی بنیاد بنائے ہوئے ہے۔ ہندستان کے مسلمان ہندو خطرہ کے نام پر جی رہے ہیں۔ اسی منفی ذہن کا یہ نتیجہ ہے کہ سلمان رشدی یا بوسنیا کا مسئلہ ان کو متحد کر سکتا ہے مگر کوئی مثبت چیز انھیں متحد نہیں کرتی :

Salman Rushdie or Bosnia might bring them together, but not something positive.

۲۴ ستمبر کو وگن میں عربوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کو عرب ممالک بہت بڑے پیمانہ پر مالی مدد دے رہے ہیں۔ حالاں کہ ان کے انقلابی نظریات ملوکیت کے سراسر خلاف ہیں۔ پھر یہ ملک کیوں ایسا کرتے ہیں۔ ایک عرب نوجوان نے کہا : لماذا البلاد العربیة تدعم هذه الحرکات۔ لان البلاد العربیة ترید ان تحتوی هذه الحرکات لتتجنب خطر هذه الحرکات۔

میں نے کہا : گویا کہ یہاں عرب ملکوں اور ان تحریکوں کے درمیان ایک خاموش انڈر سٹینڈنگ ہے۔ تم ہم کو مال دیتے رہو، ہم تم سے ٹکراؤ نہیں کریں گے۔

مغربی یورپ میں نسلی امتیاز کی برائی پہلے سے موجود ہے۔ اب وہ مزید شدت کے ساتھ زندہ ہو رہی ہے۔ خاص طور پر جرمنی، فرانس اور برطانیہ میں اس کی لہر زیادہ تیز ہے۔ نوآبادیاتی دور میں ان ملکوں میں بڑی تعداد میں ایشیائی اور افریقی باشندے بطور مزدور لے جائے گئے تھے۔ وہ لوگ وہیں آباد ہو گئے اور اب وہ وہاں کے شہری بن چکے ہیں۔ مگر نئے نسل پرستوں کا کہنا ہے کہ وہ ہمارے مہمان کارکن (guest workers) تھے نہ کہ ہمارے ملک کے باقاعدہ شہری۔ اس طرح جو نسلی پالیسی (racist policy) ابھر رہی ہے، اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک نئی سماجی تفریق (social divide) وجود میں آنے والی ہے جو وہائٹ اور غیر وہائٹ کی تقسیم پر مبنی ہو گی۔ اس میں غالباً صرف جاپانیوں کو آنریری وہائٹ (honorary whites) کے طور پر

تسلیم کیا جائے گا۔ تاہم یورپ کے سنجیدہ لوگ اس کو خود یورپ کے لئے ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔ ایک بوڑھے پروفیسر نے کہا :

If the Europe of the future deals with the rest of the world on the basis of race, it would make itself ineligible for world leadership.

یعنی اگر مستقبل کا یورپ بقیہ دنیا سے نسل کی بنیاد پر معاملہ کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو عالمی قیادت کے لئے نااہل بنالے گا۔ ایک اور بوڑھے یورپین نے کہا کہ یہ چیز یورپ کے لئے اس کے عالمی کردار میں رکاوٹ بن سکتی ہے اور امریکہ دوبارہ آزادی اور ترقی کا واحد علم بردار بن کر ظاہر ہوسکتا ہے :

It may deprive Europe of its world role. And the United States might again emerge as the real defender of liberty and progress.

یہاں تجارتی مقاصد کے لئے نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ میں وگن میں اپنی قیام گاہ کی بیرونی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ سامنے کی سڑک پر مسلسل دونوں طرف کاریں دوڑتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اس درمیان سڑک کے کنارے لگے ہوئے ایک بورڈ پر نظر پڑی، اس پر لکھا ہوا تھا — ۶۷ پونڈ فی ہفتہ کے ذریعہ اس گھر کو اپنا لو :

Own this house from £ 67 per week.

انڈیا میں اس طرح کا بورڈ میں نے نہیں دیکھا۔ تاہم اگر یہاں ایسا بورڈ لگایا جائے تو شاید اس پر لکھا ہوا ہوگا کہ اس گھر کا کرایہ ۶۷ پونڈ فی ہفتہ ہے۔ مگر یورپ کے لوگوں کی نفسیات اس اسلوب سے مطابقت نہیں رکھتی۔ مذکورہ اشتہار اسی کی ایک مثال ہے۔

۲۴ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ چند عرب نوجوانوں کے ساتھ میں مانچسٹر گیا۔ وہاں کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ یہاں کے امام کوئی فلسطینی یا اردنی تھے۔ انھوں نے فلسطین میں دشمنان اسلام کے ظلم اور سازش پر انگریزی میں پرجوش تقریر کی۔ دنیا کے جس حصہ میں بھی آپ جائیں وہاں کے مسلمانوں کے مجالس یا اجتماعات کا مشترک موضوع صلیبیوں، صہیونیوں وغیرہ کی سازش ہوتا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ان نام نہاد سازشوں کا اعلان تو سو سال سے کیا جارہا ہے۔ مگر اس کا ذرہ برابر

بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا. پھر اس کو مزید جاری رکھنے کا کیا فائدہ۔

میں نے ایک مجلس میں کہا کہ دو سو سال پہلے مسلمان غلبہ کی حالت میں تھے. اس کے بعد ان پر ضعف کا دور آیا۔ اس کے بعد یورپی استعمار نے ان کو مغلوب کر لیا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ کو فلسطینی لیڈروں کا اسرائیل کا اعتراف کر لینے کے بعد ملت کی تاریخ ذلت کے دور میں داخل ہو گئی۔ اس درمیان میں ہزاروں بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں، سیکڑوں بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں۔ مسلمانوں نے بے شمار قربانیاں دیں مگر نتیجہ معکوس صورت میں نکلا. غلبہ کے بعد ضعف، اس کے بعد مغلوبیت اور اس کے بعد ذلت، یہ تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں موجودہ پر شور تحریکوں کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر ان کی قیمت ہوتی تو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا یہ انجام نہ ہوتا۔

یہاں کی ایک مسجد میں دیوار پر ایک تختی لگی ہوئی نظر آئی ۔ نیچے رحل کی صورت میں پیتل کی دو تلواریں بنی ہوئی تھیں اور اس کے اوپر اللہ لکھا ہوا تھا۔ پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ عرب ممالک میں اس قسم کی تختی عام ہو گئی ہے. مسجد، ادارہ، مکان ہر جگہ لوگوں نے اس کو لگا رکھا ہے۔

مجھے اس کو دیکھ کر سخت تکلیف ہوئی۔ میں نے کہا کہ اللہ کے رسول نے تو دعا میں کہا تھا کہ اَللّٰھم انت السلام ومنك السلام واليك يرجع السلام. مگر یہ مسلمان اس پر راضی نہیں ہوئے. اس کو بدل کر انھوں نے اپنی دیواروں پر یہ لکھ دیا کہ —— اَللّٰھمّ اَنتَ السَّيف. یہ بلاشبہ جرم ہے نہ کہ کوئی اسلامی عمل۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق خدا لامحدود ہے۔ وہ کیسے؟ میں نے کہا کائنات محدود ہے اور محدود کو محدود پیدا نہیں کر سکتا. صرف لامحدود ہی محدود کو پیدا کر سکتا ہے۔ (الكون محدود وهذا يدل على ان الخالق لامحدود. فان لم يكن الخالق لامحدود لما استطاع ان يخلق المحدود)

وگن کا ایک علاقائی اخبار نکلتا ہے اس کا نام وگن رپورٹر (Wigan Reporter) ہے۔ اس کے شمارہ ۲۳ ستمبر ۱۹۹۳ میں جیک وھٹکر (Jack Whittacker) کے نام سے ایک مراسلہ پڑھا۔ اس

کے آخر میں یہ الفاظ درج تھے کہ میں خود سوچتا ہوں اور میں خود اپنی رائے قائم کرتا ہوں۔ مگر ہمیشہ دوسروں کا نقطہ نظر سننے کا خواہش مند رہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں ان سے اتفاق نہ کروں مگر میں ان کا احترام کرتا ہوں :

I do my own thinking and form my own opinions but always willing to listen to other people's opinions. I may not agree but I do respect them. (Jack Whittacker)

مکہ مدینہ کا فرق بتاتے ہوئے کچھ عرب نوجوانوں سے میں نے ہجرت کے بارہ میں کہا :

بعد ما نظرت فی ھذہ الحقائق فسوف تقول ان الھجرة لم یکن کفرار بل الھجرة کانت الذھاب من اللافرصة الی الفرصة۔

ایک عرب نوجوان نے ۲۵ ستمبر کی ملاقات میں بتایا کہ وہ اسلامی مرکز کی عربی مطبوعات سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد ایک تقلیدی شخص ان سے جھگڑنے لگا۔ اور کہا کہ "وحید الدین خاں کی کتاب مت پڑھو ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے"۔ آخر کار دونوں میں طے ہوا کہ وہ مانچسٹر کے ایک عالم کے پاس جائیں اور اس سے اس کا فیصلہ لیں۔ چنانچہ دونوں مانچسٹر کے عالم کے پاس گئے۔

عالم نے مذکورہ شخص سے پوچھا کہ وحید الدین خاں کی کتابوں میں آپ نے کیا غلطی پائی ہے۔ اس کے بعد اس شخص نے "حکمة الدعوة" پیش کی اور اس کی ایک غلطی بتائی۔ عالم نے کتاب کا مذکورہ صفحہ پڑھا اور اس شخص نے کہا کہ تم مجھ کو غبی معلوم ہوتے ہو۔ اس عبارت میں وہ بات موجود ہی نہیں جو تم اس کی طرف منسوب کرتے ہو۔ وہ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔

آخر میں جب دونوں وہاں سے اٹھے تو مذکورہ عالم نے عرب نوجوان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ : لقد أظھر اللّٰہ لک الحق۔ یہ واقعہ ۱۰ جون ۱۹۹۳ کا ہے جو مانچسٹر میں پیش آیا۔

قاہرہ سے ایک مجلہ شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام احداث العالم الاسلامی ہے۔ اس کا شمارہ ۱۹۹۳ میں نے دیکھا جو ۷۰۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں ۸ صفحات کی رپورٹ تھی۔ اس کو پڑھ کر میں نے کچھ عربوں سے کہا :

اذا ما قرأتم ھذہ الصفحات عن الھند فسوف تستنبطون منھا ان الھند ھی بلد المشاکل ولیست بلد الامکانیات۔ والھند فی الحقیقة، کغیرھا من البلدان، ھی بلد الفرص

والإمكانيات. وكيف لا تكون كذالك. والله سبحانه وتعالیٰ يقول فی القرآن: إنّ مع العسر يسراً ، إنّ مع العسر يسراً۔

۲۶ ستمبر کو لیبیا کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی ضرورت کے تحت انگلینڈ آئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ امریکہ نے لیبیا کے خلاف جو پابندیاں لگائی ہیں ان کے بارہ میں لیبی عوام کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے فوراً کہا :

الليبيون نتيجة الظلم السياسی والحرمان الاقتصادی وللتحرر من القيد الداخلی ينتظرون أميركا لكی تأتی وتستلم البلاد۔ فهذا احديث رجل الشارع اليوم۔

میں نے کہا کہ یہ صرف لیبیا کی بات نہیں ہے بلکہ تقریباً تمام مسلم ملکوں کا معاملہ یہی ہے۔ ہر جگہ یہی صورت حال ہے کہ اگر کسی طرح امریکہ ان ملکوں پر قابض ہو جائے تو ہر ملک کے عوام خوش دلی کے ساتھ اس کو قبول کر لیں گے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر مسلم ملک میں جس شخص کو موقع ملتا ہے وہ فوراً پرواز کر کے امریکہ پہنچ جاتا ہے :

هٰذه حالة كل البلدان الاسلامية ۔ والدليل علیٰ هٰذا هو ان كل من تو اتيه الفرصة فانه يستقل اول طائرة لكی يصل الیٰ امريكا۔

۲۷ ستمبر کی شام کو میں ایک عرب نوجوان کے ساتھ قریب کے ایک پارک میں ٹہلنے کے لئے گیا۔ ہم لوگ ایک راستہ پر چل رہے تھے۔ اتنے میں دو سفید فام نوجوان ہمارے پاس سے گزرے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر ان میں سے ایک شخص نے کہا :

Nigger, Nigger, Black

سفید فاموں کی خاص کمزوری نسل پرستی ہے۔ اپنے اس ذہن کی بنا پر وہ ایشیائی اور افریقی لوگوں کو بلیک (سیاہ) کہتے ہیں۔ مذکورہ جملہ تحقیر اور استہزاء کے طور پر تھا۔

میں نے ایک ہندستانی مسلمان سے کہا کہ آپ لوگ انگلینڈ میں آکر بسے ہوئے ہیں۔ اور وہ آپ کو بلیک کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سب انگریز ایسے نہیں۔ انگریزوں کی اقلیت ایسا کرتی ہے۔ میں نے کہا کہ انڈیا میں بھی ہندوؤں کی صرف اقلیت مسلم مخالف بات کرتی ہے نہ کہ سارے ہندو۔ پھر یہی اصول آپ انڈیا میں بھی کیوں اختیار نہیں کرتے۔ جس طرح یہاں

آپ اس طرح کی باتوں کو اقلیت کی بات کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، اسی طرح انڈیا میں بھی اس طرح کی باتوں کو اقلیت کی بات کہہ کر نظر انداز کر دیجئے اور پھر انڈیا آپ کے لئے انگلینڈ بن جائے گا۔

اخوانی مزاج کے بعض عرب نوجوانوں کی مجلس میں میں نے کہا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے فاعرض عمن تولی۔ یہ نہیں فرمایا کہ قاتل عمن تولی یا حارب عمن تولی۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ اسلامی عمل (Islamic activism) کا بنیادی اصول ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ اعراض ہے۔

اعراض کوئی سادہ چیز نہیں وہ نہایت گہرا عمل ہے۔ اعراض کا طریقہ اختیار کرکے داعی ایک مدعو کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی روش پر مزید غور کرے، دوسری طرف داعی خود اپنے لئے یہ امکان حاصل کرتا ہے کہ اس کو صبر کا انعام دیا جائے جو کہ قرآن اور حدیث کے مطابق، سب سے بڑا اسلامی عمل ہے۔

اسی کے ساتھ اعراض کا طریقہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ جنگ اور ٹکراؤ میں اپنی طاقت کو ضائع نہ کرے بلکہ اپنی پوری طاقت کو اپنی تعمیر اور اپنے استحکام میں لگائے۔ اعراض اگرچہ ابتدائی مرحلہ میں برداشت کی قیمت چاہتا ہے۔ مگر جب اعراض کے ذریعہ فرصتِ عمل حاصل کرکے کوئی گروہ اپنے کو طاقت ور بنالے تو اس کے بعد اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اس کے مقاصد کسی جنگ کے بغیر پورے ہو جاتے ہیں۔

ایک مغربی نوجوان نے سوال کیا کہ قرآن میں ہے کہ عورتیں نافرمانی کریں تو ان کو مارو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن عورتوں کے حق میں غیر عادل ہے۔ وہ مرد کو مارنے کی اجازت دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ خود مغربی ذرائع میں چھپی ہوئی رپورٹیں بتاتی ہیں کہ عورتوں کو مارنے کا عمل سب سے زیادہ مغربی ملکوں میں ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس طرح انسانی سماج کا یہ عمومی ظاہرہ بتاتا ہے کہ مخصوص اور استثنائی حالات میں عورت کے حق میں

تنبیہی ضرب ضروری ہے۔ ورنہ خاندان کا نظام چل نہیں سکتا۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں اسلام کی عظیم ثبت دین یہ ہے کہ اس نے یہ تعلیم دی کہ عورت کی طرف سے نشوز (نافرمانی) کا مظاہرہ ہو تو ابتداءً ہر قسم کی پرامن تدبیریں کرو۔ اگر پرامن تدبیروں سے اصلاح نہ ہو تو آخری مرحلہ میں انتہائی استثنائی تدبیر کے طور پر عورت کو مار سکتے ہو۔ مگر یہاں بھی اسلام نے اس کی حد مقرر کر دی۔ اور وہ یہ کہ بس مسواک یا ٹوتھ برش جیسی چیز سے مارنا۔ یعنی علامتی مار نہ کہ حقیقی مار۔

آج ستمبر ۱۹۹۳ کی ۲۷ تاریخ ہے۔ مجھ کو دہلی سے نکلے ہوئے دس دن ہو چکے ہیں۔ امت کی موجودہ حالت اور قیامت کی ہولناکی کو یاد کر کے دل کا عجیب حال ہوا۔ میں نے سوچا کہ حشر کے میدان میں جب لوگ گروہ در گروہ جمع ہوں گے تو کوئی شخص ہوگا جو متمردین کے گروہ کا جھنڈا لے کر آئے گا۔ کوئی منافقین کا سردار بن کر چل رہا ہوگا۔ اسی طرح کوئی وہاں منحرفین کا گروہ ہوگا، کوئی محرفین کا گروہ اور کوئی متغلبین کا گروہ۔ میں نے کہا کہ خدایا، مجھے عاجزین کے ساتھ اٹھائیے۔ حشر کے دن میں عاجزین کے گروہ کے پیچھے اس احساس کے ساتھ چل رہا ہوں کہ شاید میرے عجز پر خدا کو رحم آجائے اور وہ مجھے بخش دے۔

اس سفر کے دوران یورپ کے دو ملکوں (اٹلی اور انگلینڈ) کو دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ میرا احساس یہ ہے کہ انگریزوں کی نفسیات برتری کی نفسیات ہے، اور اطالویوں کی نفسیات مقابلۃً تواضع کی نفسیات۔ سچائی کو قبول کرنے کے لئے برتری کی نفسیات ہمیشہ رکاوٹ بنتی ہے اور تواضع کی نفسیات ہمیشہ مددگار ہوتی ہے۔ نوآبادیاتی دور کے خاتمہ کے بعد مسلمان بہت بڑی تعداد میں انگلستان میں آ گئے۔ کیوں کہ یہاں ان کو مادی نفع کے مواقع زیادہ دکھائی دئے۔ اگر ان مسلمانوں کی نظر دعوتی مواقع پر ہوتی تو شاید وہ سب سے زیادہ اٹلی کے شہروں میں جاتے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے قاہرہ کی چھپی ہوئی ایک کتاب دی۔ اس کا نام تھا: تصفیۃ الوجود الاسلامی (عبد الرحمن عبد الوہاب) کھول کر مختلف مقامات پر اسے دیکھا تو کتاب جہاد کے نام پر سیف وقتال کی باتوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ

اسلام کی تاریخ صرف تلواروں نے بنائی ہے، اسلام کی تاریخ صرف جنگ نے بنائی ہے۔
(ان تاریخنا لم تصنعه الا السيوف، ان تاريخنا لم يصنعه الا القتال) صفحہ ۴۶

میں نے کہا کہ یہ بات لغویت کی حد تک غلط ہے۔ میں نے اسلامی تاریخ کے کچھ واقعات بیان کرنے کے بعد کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ آرنلڈ اور کیتھ جیسے مسیحی تو یہ کہہ رہے کہ اسلام کی تاریخ اس کی نظریاتی طاقت کے ذریعہ بنی اور مسلم دانشور یہ کہہ رہے ہے کہ اسلام کی تاریخ تلوار کی طاقت نے بنائی ہے۔ یہ سن کر حاضرین میں سے ایک عرب نوجوان نے کہا: فكأن المسيحيين يعظّمون الاسلام والقادة المسلمون يصغرون الاسلام (عادل محمد الربانی)

۲۴ ستمبر کی شام کو ایک عرب نوجوان نے سوال کیا کہ رسول اللہؐ کے بعد ہمیں دنیا میں انذار وتبشیر والا دعوتی کام نظر نہیں آتا۔ پھر بعد کی غیر مسلم قوموں کا انجام کیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں میرے جواب کا خلاصہ یہ تھا: السؤال يرجع الى علماء هٰذه الامة۔ لان الداعي اذا لم يقم بعمله فسوف يكون هو المسئول دون المدعو۔ فسوف تسئل عن علماء الامة الذين عاصروا الامم۔ لِمَ انتم فشلتم وما استطعتم ان تقوموا للشهادة امامَ الامم۔ لعل الامم سوف توقف يوم القيامة في قاعة الانتظار والعلماء سوف يجدون انفسهم في قاعة الاستجواب۔

اٹھارویں صدی میں ہندستان کے لوگ خاص طور پر مسلمان، انگریزوں کو صرف ظالم اور لٹیرے کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ اس وقت انگریز قوم کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہالت کی تاریکی سے نکل کر ایک علم دوست قوم بنے ہوئے تھے۔ آج بھی یہ حال ہے کہ یہاں کے بہت سے لوگ ۸۰ سال کی عمر میں بھی نئی معلومات حاصل کرنے کے شوق میں ایوننگ کلاس میں داخلہ لے لیتے ہیں۔

۱۸۵۷ میں ہندستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت منظم کی گئی۔ عین اسی سال یہاں کی قدیم برٹش لائبریری میں مشہور راؤنڈ ریڈنگ روم (round reading room) بن کر تیار ہوا تھا جس میں ڈکنس، لینن، مارکس، تھیکرے، شا، ہارڈی جیسے نامور لوگوں نے بیٹھ کر مطالعہ کیا۔ برطانیہ کے شہروں میں بے شمار تعداد میں پبلک اور پرائیویٹ لائبریریاں قائم ہیں۔

ٹی وی کے موجودہ دور میں بھی یہاں کتابوں کے مطالعہ کا وسیع ذوق پایا جاتا ہے۔ لوگ بہت بڑے پیمانہ پر کتابیں خریدتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ میں میں نے حسب ذیل سطریں پڑھیں کہ ایک کتابی ادارہ نے ایک انوکھا منصوبہ بنایا۔ اس نے اعلان کیا کہ کتاب خرید کر اپنے گھر لے جاؤ۔ دیکھنے کے بعد کتاب پسند نہ آئے تو اس کو لوٹا کر اپنی رقم واپس لے لو۔ یہ اندیشہ بہت مبالغہ آمیز ثابت ہوا کہ ہر آدمی دوبارہ کتاب لے کر اپنی رقم واپس مانگنے آجائے گا:

One chain offered a unique plan. Buy a book, take it home and if you are not happy, get your money back. The fears that every one will come back to claim a refund were exaggerated.

واشنگٹن میں مجلہ احداث العالم الاسلامی کا شمارہ ۱۹۹۳ دیکھا۔ یہ مجلہ ۷۰۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ ہر سال چھپتا ہے۔ اس کا پتہ یہ ہے:

دار الاعتصام، ۸ شارع حسین حجازی، القاہرہ ۱۱۵۱۱۔

اس میں مختلف ملکوں سے متعلق اسلامی خبریں درج تھیں۔ اٹلی کے عنوان کے تحت ایک خبر یہ تھی کہ ایک اطالوی خاتون نے اپنی ریسرچ کے نتائج چھاپے ہیں۔ اس میں بتایا گیا کہ یورپ میں سب سے پہلا عربی قرآن اٹلی میں ۳۸-۱۵۳۷ میں چھاپا گیا تھا۔ یہ ۲۳۲ صفحہ پر مشتمل تھا۔ یہ ساڑھے چار سو سال پہلے کی بات ہے۔ چھپنے کے بعد اس قرآن کے نسخے پوپ کے حکم سے جلا دئے گئے تھے۔ تاہم اس قرآن کا ایک نسخہ مذکورہ خاتون کو اطالوی کتب خانہ میں ملا ہے جس کی نشاندہی انھوں نے اپنے مقالہ میں کی ہے۔

مجلہ احداث العالم الاسلامی (۱۴۱۳ھ، ۱۹۹۳) میں ایک باب کشمیر کے بارہ میں تھا۔ اس میں کارنامۂ جہاد کے طور پر درج تھا کہ کشمیر کے مجاہدین نے ہندو فوج کے دس ہزار سے زیادہ افراد کو قتل کیا ان العملیات الجہادیۃ ادت الی قتل اکثر من عشرۃ آلاف من الجنود الہندوس) صفحہ ۲۴۰

اس کو پڑھ کر میں نے کہا کہ اسلام میں جہاد کا عمل یہ تھا کہ دس ہزار انسانوں کو خدا کے دین میں داخل کیا جائے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مجاہدوں کے نزدیک جہادی عمل یہ ہے کہ دس ہزار انسانوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔

۱ ویکلی میگزین راشٹریہ سہارا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر سیتا رام نے ۲۴ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کٹرتا نہ اسلام میں ہے اور نہ کسی دوسرے مذہب میں۔ اصل یہ ہے کہ کسی مذہب کے لوگوں میں جب مذہب کی اسپرٹ باقی نہیں رہتی تو فارم کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اسی سے کٹرپن پیدا ہوتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ لوگوں میں پھر سے اسپرٹ پیدا کی جائے۔

۲ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر کملیش ترپاٹھی نے ۲۶ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ کامن سول کوڈ کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ مفروضہ کامن سول کوڈ نہ تو ممکن ہے اور نہ مفید۔ حتی کہ زبردستی ایسا ایکٹ بنا دیا جائے تو عملاً وہ ہرگز چلنے والا نہیں۔ پھر ایسے بے فائدہ کام میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت۔

۳ مز اسماء عرشی نے ۲۷ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو انگریزی اخبار سنڈے آبزرور کے لئے لیا گیا اور اس کا موضوع کامن سول کوڈ تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ جدید طبقہ نے کامن سول کوڈ کو ایک فرضی آئیڈیل بنا لیا ہے۔ حالاں کہ وہ موجودہ حالات میں نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔

۴ انگریزی ماہنامہ لیگل نیوز اینڈ ویوز (نئی دہلی) کے ایڈیٹر ڈاکٹر بھرت جھن جھن والا نے ۲۷ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ انڈین نیشن کی تعمیر کے لئے تمام فرقوں میں یکساں تاریخی شعور پر زور دینا ایک غیر متعلق بات ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں کہیں بھی تاریخی شعور کی یکسانیت پر قوم نہیں بنی ہے۔ بلکہ سادہ طور پر یکساں وطن کی بنیاد پر قوم بنی ہے، اور اسی طرح انڈیا میں بھی بن سکتی ہے۔

۵ ایک صاحب نے صدر اسلامی مرکز کی کتاب 'پیغمبر انقلاب' کا تامل زبان میں

ترجمہ کیا ہے۔ جس کو وہ دعوتی جذبہ کے تحت چھپوا کر مفت یا علامتی قیمت پر تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھیں مالی تعاون درکار ہے۔ جو اہل خیر حضرات اس کام میں تعاون دینا چاہتے ہیں وہ ازراہِ کرم حسب ذیل پتہ پر براہ راست رابطہ قائم فرمائیں۔

۶ دی فیڈریشن آف انڈین پبلشرس کی طرف سے ہر سال ملک کی مختلف زبانوں (مثلاً ہندی، اردو اور انگلش وغیرہ) میں چھپنے والی مطبوعات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اور ان میں سے جو کتابیں اپنی خصوصیات کی بنا پر سال کی بہترین مطبوعات سمجھی جاتی ہیں ان پر انعامات دیے جاتے ہیں۔ سال ۱۹۹۴ کے لئے جن کتابوں کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا ان میں ایک اسلامی مرکز کی مطبوعہ "عظمت اسلام" کا پیپر بیک اڈیشن ہے۔ یہ انعام ایک تمغہ اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔

۷ ۴ جون ۱۹۹۵ کی شام کو شاہدرہ (جگ جیون نگر) سرو دھرم سمبھاؤ سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مثبت طرز فکر اور مذہبی احترام پر تقریر کی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اختلافات کی اس دنیا میں ایک دوسرے کا احترام کر کے ہی صحت مند سماج بنایا جا سکتا ہے۔

۸ رشی کیش میں پرمارتھ نکیتن آشرم کے زیر اہتمام ایک بڑا مذہبی جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ۹ جون ۱۹۹۵ کو جلسہ سے خطاب کیا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان کی ترقی کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے نیشنل اسپرٹ اور پازیٹو تھنکنگ۔ نیشنل اسپرٹ یہ ہے کہ ذاتی مفاد کی خاطر دیش کے مفاد کو قربان نہ کیا جائے۔ اور پازیٹو تھنکنگ یہ ہے کہ شکایات کے موقع پر منفی ردعمل سے بچنا اور مثبت رویہ اختیار کرنا۔

۹ دہلی کی ٹی وی تنظیم (کمیونی کیشن گروپ) کی ٹیم ۱۴ جون ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کامن سول کوڈ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کامن سول کوڈ ہونا

چاہئے یا نہیں ہونا چاہئے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کامن سول کوڈ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ میرے نزدیک اس کا کوئی امکان نہیں۔ حتی کہ ایکٹ بنا دیا جائے تب بھی وہ لاگو نہیں ہو سکے گا۔ اور وہ اسی طرح معطل ہو کر رہ جائے گا جس طرح سول میرج ایکٹ معطل ہو کر رہ گیا ہے۔

۱۰ ایک پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے ۱۶- ۱۹ جون ۱۹۹۵ کو بمبئی کا سفر کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۱ دہلی کے ہندی روزنامہ پبلک ایشیا کے نمائندہ مسٹر محمد رؤف الرحمٰن نے ۲۰ جون ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر یونیفارم سول کوڈ کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دستوری دفعہ ۴۴ (یونیفارم سول کوڈ) خود دستور کی دفعہ ۲۵ (مذہبی آزادی) سے ٹکراتی ہے۔ اس لئے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ دستور میں ایک اور ترمیم کرکے دفعہ ۴۴ کو حذف کر دیا جائے۔

۱۲ یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ وقت کا نہایت اہم ملی مسئلہ بن گیا ہے۔ اس پر ایک مضمون دہلی کے انگریزی میگزین نیشن اینڈ دی ورلڈ (یکم جون ۱۹۹۵) وغیرہ میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا تفصیلی مضمون "یکساں سول کوڈ" الرسالہ (ستمبر ۱۹۹۵) میں نیز علاحدہ کتابچہ کی شکل میں چھپ چکا ہے۔ اس کا انگریزی اور ہندی ترجمہ بھی ان شاء اللہ جلد چھپ جائے گا۔

۱۳ انڈین ٹیلیویژن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (گل مہر پارک) کی ٹیم نے سویڈش ٹی وی (ZEN ZAT AB) کے لئے ۱۱ جولائی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کامن سول کوڈ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ کامن سول کوڈ کو قانونی طور پر نافذ کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔

۱۴ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۹ جون ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: وقت کا استعمال۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وقت ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ وقت کو نہ کھوئے اور اس کو پوری طرح استعمال کرے۔

۱۴ میڈیا اسٹار کے نمائندہ مسٹر سلیم صدیقی نے ۳۱ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ٹیلیفون پر لئے گئے اس انٹرویو کا تعلق سپریم کورٹ کے فیصلہ (کامن سول کوڈ) سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جوڈیشیری اور لیجسلیچر میں واضح فرق ہے۔ اس فیصلہ میں جزئی طور پر جوڈیشیری نے اپنی حد سے تجاوز کر کے لیجسلیچر کے دائرہ میں قدم رکھ دیا ہے۔

۱۵ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر شیام سندر سنگھ نے ۲۴ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کامن سول کوڈ کے سوال سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دستور کی دفعہ ۲۵ (مذہبی آزادی) دستور کی دفعہ ۴۴ (کامن سول کوڈ) سے ٹکراتی ہے۔ اس لئے اگر کامن سول کوڈ لانا ہے تو مذہبی آزادی کی دفعہ کو ختم کیجئے۔ اور اگر مذہبی آزادی کی دفعہ کو باقی رکھا جاتا ہے تو کامن سول کوڈ کی دفعہ کو حذف کرنا پڑے گا۔ پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی یہ کہتے تھے کہ جب تک مسلم سماج کی طرف سے مانگ نہ کی جائے ہم کامن سول کوڈ نہیں بنائیں گے۔ یہ مسلمانوں کے تسلی کرنے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس لئے تھا کہ دستور میں دی ہوئی مذہبی آزادی کی بنا پر حکومت ایسا نہیں کر سکتی کہ قانون کے زور پر کامن سول کوڈ کو لاگو کر دے۔

۱۶ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۵ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی اس کا موضوع تھا: صوفی نور الدین کشمیری، حالات اور اقوال۔ ان کا ایک قول جو نقل کیا گیا وہ یہ تھا کہ: میں نے تلوار توڑ دی اور اس سے درانتی بنالی۔

۱۷ اُرن کول پروڈکشن (بمبئی) کی ویڈیو ٹیم ۲۳ مارچ ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے۔ موجودہ زمانہ میں "نظام مصطفیٰ" یا اسلامی حکومت قائم کرنے پر جو لوگ مختلف مقامات پر بطور خود جنگ چھیڑے ہوئے ہیں، وہ محض سطحی لیڈری ہے نہ کہ کوئی دینی عمل اسلامی جہاد۔ اس طرح بم اور گن چلانے سے صرف فساد پیدا ہوتا ہے، اس سے کبھی کوئی حقیقی اصلاح ظہور میں نہیں آسکتی۔

# عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

## اُردو

| | Rs. | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| تذکیر القرآن جلد اول | 200/- | تاریخ دعوت حق | 5/- | نارِ جہنم | 7/- |
| تذکیر القرآن جلد دوم | 200/- | مطالعۂ سیرت | 12/- | خلیج ڈائری | 10/- |
| اللہ اکبر | 45/- | ڈائری جلد اول | 100/- | رہنمائے حیات | 7/- |
| پیغمبر انقلاب | 40/- | کتاب زندگی | 55/- | مضامین اسلام | 45/- |
| مذہب اور جدید چیلنج | 45/- | انوارِ حکمت | - | تعددِ ازدواج | 10/- |
| عظمتِ قرآن | 50/- | اقوالِ حکمت | 25/- | ہندستانی مسلمان | 40/- |
| عظمتِ اسلام | 50/- | تعمیر کی طرف | 8/- | روشن مستقبل | 7/- |
| عظمتِ صحابہ | 7/- | تبلیغی تحریک | 20/- | صوم رمضان | 12/- |
| دین کامل | 50/- | تجدید دین | 35/- | علم کلام | 9/- |
| الاسلام | 40/- | عقلیاتِ اسلام | 50/- | اسلام کا تعارف | 2/- |
| ظہور اسلام | 70/- | مذہب اور سائنس | - | علماء اور دور جدید | 8/- |
| اسلامی زندگی | 25/- | قرآن کا مطلوب انسان | 8/- | سیرتِ رسولؐ | 10/- |
| احیاءِ اسلام | 40/- | دین کیا ہے | 5/- | ہندستان آزادی کے بعد | 1/- |
| رازِ حیات | 50/- | اسلام دین فطرت | 7/- | مارکسزم تاریخ جس کو رد کرچکی ہے | 7/- |
| صراطِ مستقیم | 40/- | تعمیر ملت | 7/- | | |
| خاتون اسلام | 50/- | تاریخ کا سبق | 7/- | سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ | 4/- |
| سوشلزم اور اسلام | 70/- | فسادات کا مسئلہ | 5/- | منزل کی طرف | 2/- |
| اسلام اور عصر حاضر | 50/- | انسان اپنے آپ کو پہچان | 8/- | الاسلام یتحدیٰ (عربی) | 85/- |
| الربانیہ | 40/- | تعارف اسلام | 5/- | | |
| کاروانِ ملت | 45/- | اسلام پندرھویں صدی میں | 10/- | | |
| حقیقتِ حج | 30/- | راہیں بند نہیں | 12/- | | |
| اسلامی تعلیمات | 25/- | ایمانی طاقت | 7/- | | |
| اسلام دور جدید کا خالق | 25/- | اتحادِ ملت | 7/- | | |
| حدیثِ رسولؐ | 35/- | سبق آموز واقعات | 7/- | | |
| سفرنامہ (غیر ملکی اسفار) | 85/- | زلزلۂ قیامت | 20/- | | |
| سفرنامہ (ملکی اسفار) | - | حقیقت کی تلاش | 12/- | | |
| میوات کا سفر | 35/- | پیغمبر اسلام | 5/- | | |
| قیادت نامہ | - | آخری سفر | 7/- | | |
| راہِ عمل | 25/- | اسلامی دعوت | 7/- | | |
| تعبیر کی غلطی | 95/- | خدا اور انسان | 12/- | | |
| دین کی سیاسی تعبیر | 20/- | حل یہاں ہے | 10/- | | |
| امہات المومنین | 20/- | سچا راستہ | 8/- | | |
| عظمتِ مومن | 7/- | دینی تعلیم | 12/- | | |
| اسلام ایک عظیم جدوجہد | 3/- | حیاتِ طیبہ | 7/- | | |
| | | باغِ جنت | 7/- | | |

## ھندی

| | |
|---|---|
| سچائی کی تلاش | 8/- |
| انسان اپنے آپ کو پہچان | 4/- |
| پیغمبرِ اسلامؐ | 4/- |
| سچائی کی کھوج | 10/- |
| آخری سفر | 8/- |
| اسلام کا پریچے | 8/- |
| پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی | 8/- |
| راستے بند نہیں | 7/- |
| جنت کا باغ | 8/- |
| بھوتکتی واد اور اسلام | 10/- |
| اتہاس کا سبق | 9/- |
| اسلام ایک سوابھاوک مذہب | 8/- |
| اجول بھوشیہ | 8/- |
| پوتر جیون | 8/- |
| منزل کی اُور | 3/- |

## English

| | |
|---|---|
| God Arises | Rs. 95/- |
| Muhammad: The Prophet of Revolution | 85/- |
| Islam As It Is | 55/- |
| God-Oriented Life | 70/- |
| Religion and Science | 45/- |
| Indian Muslims | 65/- |
| The Way to Find God | - |
| The Teachings of Islam | - |
| The Good Life | - |
| The Garden of Paradise | - |
| The Fire of Hell | - |
| Man Know Thyself! | 8/- |
| Muhammad: The Ideal Character | 5/- |
| Tabligh Movement | 25/- |
| Polygamy and Islam | 10/- |
| Words of the Prophet | 75/- |
| Islam: The Voice of Human Nature | 30/- |
| Islam: Creator of the Modern Age | 55/- |
| Woman Between Islam and Western Society | 95/- |
| Woman in Islamic Shari'ah | 65/- |
| Hijab in Islam | 20/- |

## آڈیو کیسٹ

| | Rs. |
|---|---|
| حقیقتِ ایمان | 25/- |
| حقیقتِ نماز | 25/- |
| حقیقتِ روزہ | 25/- |
| حقیقتِ زکوٰۃ | 25/- |
| حقیقتِ حج | 25/- |
| سنتِ رسولؐ | 25/- |
| میدانِ عمل | 25/- |
| رسول اللہ کا طریق کار | 25/- |
| اسلامی دعوت کے جدید امکانات | 25/- |
| اسلامی اخلاق | 25/- |
| اتحادِ ملت | 25/- |
| تعمیرِ ملت | 25/- |
| نصیحتِ لقمان | 25/- |

Delhi Postal Regd. No. DL/11154/95